ماہنامہ
اکتوبر 2023ء
طلوعِ اسلام
لاہور
اشاعت کا اسی واں سال

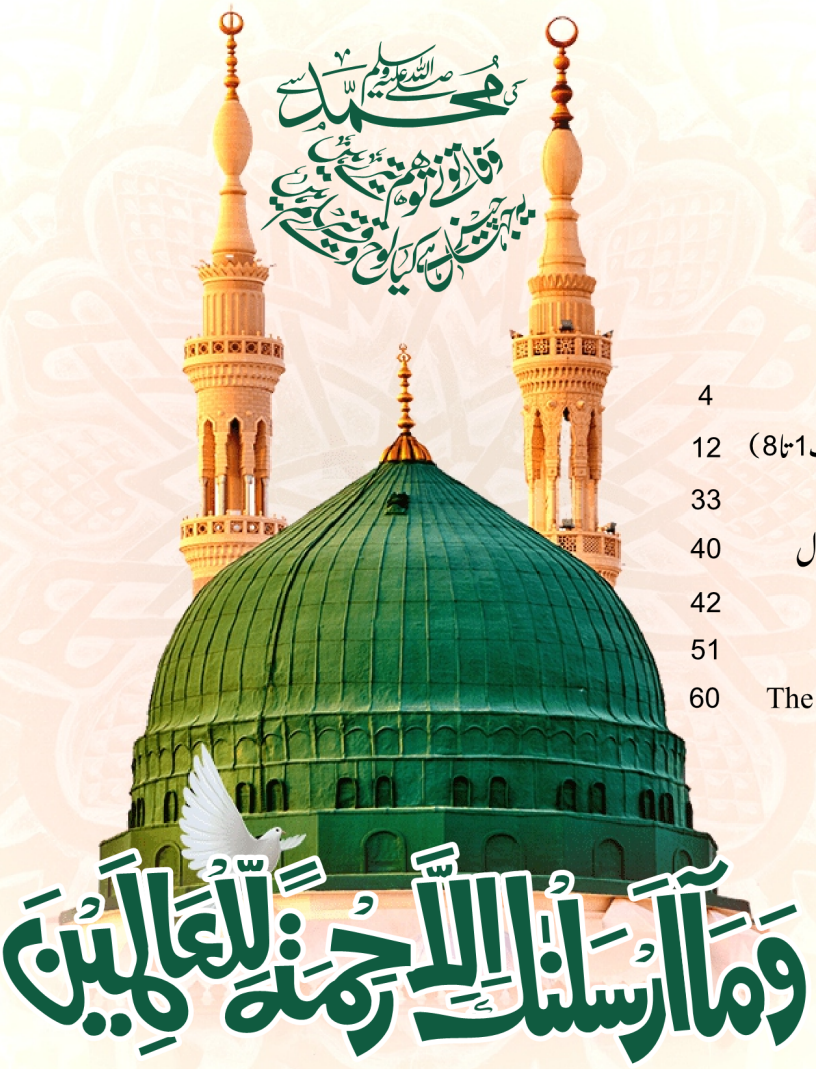
قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ



اس شمارے میں:

- لمعات: صبحِ بہار 4
- درسِ قرآن (سورۃ آلِ عمران، آیات 1 تا 8) 12
- نکتہ شرعِ مبین 33
- قرآن سے اسلام کے صحیح تصور کا حصول 40
- متحرک نفسیات (دوسری قسط) 42
- باب المراسلات 51
- The Human Self & Allah 60

اسوارِ اشہبِ دوراں بیا

خیز و قانونِ اخوت ساز نو — جامِ صہبائے محبت باز نو

باز در عالم بیار ایامِ صلح — جنگ جویاں را بدہ پیغامِ صلح

شورشِ اقوام را خاموش کن — نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن

باز ایں اوراق را شیرازہ کن — باز آئینِ محبت تازہ کن

رہروان را منزلِ تسلیم بخش — قوتِ ایمانِ ابراہیم بخش

نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی — کاروانِ زندگی را منزلی

سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر
از جبینِ شرمسارم باگیر!

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
اکتوبر 2023ء

جلد 76 | شمارہ نمبر 10

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: صبحِ بہار	ادارہ	4
درسِ قرآن (سورۃ آلِ عمران، آیات 1 تا 8)	پرویز علیہ الرحمۃ	12
نکتہ شرع مبین	شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور	33
قرآن سے اسلام کے صحیح تصور کا حصول	یوسف سیجا، کراچی	40
متحرک نفسیات (دوسری قسط)	راجہ عبدالعزیز، آزاد کشمیر	42
باب المراسلات	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	51

ENGLISH SECTION

The Human Self and Allah
By G. A. Parwez (Translated by: Dr. Ejaz Rasool)
Episode No. 19 — 60

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو، بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے
ہوئے مدفونِ دریا زیر دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گہر نکلے
غبارِ رہ گزر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو، اکسیر گر نکلے
ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے
حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے
زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے
جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے
یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

صبحِ بہار

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی

جب زمین گرمی کی شدت سے تمتما اُٹھتی ہے، تمازتِ آفتاب اس کی رگ رگ سے نمِ زندگی چُوس لیتی ہے۔ آسمان کی شعلہ ریزیاں ساری فضا کو دہکتا ہوا انگارا بنا دیتی ہیں۔ بادِ سموم کی ہلاکت سامانیاں تازگی و شگفتگی کی ہر نمود کو جھلس ڈالتی ہیں۔ پھول مرجھا جاتے ہیں۔ شگوفوں کی گردن کے منکے ٹوٹ جاتے ہیں۔ لالہ کا رنگ اُڑ جاتا ہے۔ پتّیاں سُوکھ جاتی ہیں۔ شاخیں پژمُردہ ہو جاتی ہیں۔ لہلہاتی کھیتیاں خشک ہو جاتی ہیں۔ سَرو و صنوبر آتش دانِ ارضی کے دُود کش دکھائی دیتے ہیں۔ نابندہ چشمے دیدۂ کور کی طرح بے نور ہو جاتے ہیں۔ مرمریں ندیاں خطِ تقدیرِ محکوماں کی طرح بے آب رہ جاتی ہیں۔ لُو کی دہشت سے سارے کلے نپتے ہیں۔ راستے ہانپتے ہیں۔ خُنکی غاروں میں منہ چھپا لیتی ہے۔ ٹھنڈک سہم کر کنوؤں میں جا دبکتی ہے۔ وفورِ تپش سے سینۂ کائنات میں سانس رُکنے لگتی ہے۔ جنگل کے جانور آسمانی شعلوں کی لپیٹ سے کہیں پناہ نہیں پاتے۔ پرندے اپنے گھونسلوں میں نرم و نازک زبانیں نکالے نڈھال ہو کر پڑ جاتے ہیں۔ طائرِ نگاہ تک بھی کاشانۂ چشم میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ انسان، زندگی اور اس کی تمام لطافتوں سے مایوس ہو جاتا ہے۔ سوختہ بخت کسان کھیت کے کنارے کھڑا للچائی ہوئی نظروں سے آسمان کی طرف تکتا ہے کہ کہیں سے اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان دکھائی دے لیکن اس کی خاسر و نامراد نگاہیں، حسرت بن کر اس کے ویرانۂ قلب میں لوٹ آتی ہیں۔ اس طرح جب حیاتِ ارضی کے کسی گوشے میں بھی اُمید کی نمی باقی نہیں رہتی اور بساطِ کائنات

کے کسی کونے میں بھی زندگی کی کوئی تازگی دکھائی نہیں دیتی تو یاس و نا اُمیدی کے اس انتہائی عالم میں مبداءِ فیض کی کرم گستری سے سحابِ رحمت کسان کی آنکھوں کا نور بن کر فضائے آسمانی پر چھا جاتا ہے اور اپنی جواہر پاشیوں اور گہر ریزیوں سے دامنِ ارض کو بھر پور کر دیتا ہے۔ زمینِ مردہ میں پھر سے زندگی آجاتی ہے۔ رگِ کائنات میں نبضِ حیات پھر سے متموّج ہو جاتی ہے۔ فضا کے سینے میں رُکی ہوئی سانس پھر سے زندگی کی جوئے رواں بن جاتی ہے۔ چشموں کی خشک آنکھیں شرابِ زندگی کے چھلکتے ہوئے جامِ نور بن جاتی ہیں۔ ندیوں کی بے آب لکیریں بادۂ جاں فزا کی مسیحا نفسی سے رگِ جان میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ سہمی ہوئی خنکیاں غاروں سے نکل کر فضاؤں پر چھا جاتی ہیں۔ دبکی ہوئی بُو دتیں، کنوؤں کی تہوں سے اچھل کر بساطِ ارض پر پھیل جاتی ہیں۔ خشک پتیوں میں جان پڑ جاتی ہے۔ مرجھائے ہوئے پھولوں میں از سرِ نو تازگی و شگفتگی آجاتی ہے۔ شگوفے چٹکتے ہیں، کلیاں مہکتی ہیں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے نفیس و لطیف جھونکے سرسبز و شاداب درختوں کی شاخوں میں لچک اور پھولوں میں یوں جُنبش پیدا کر دیتے ہیں گویا ــــ بہار جھُول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں ــــ ہر طرف ایک نئی زندگی اور ہر سمت ایک حیاتِ تازہ، جھُومتی، مسکراتی، مچلتی، لوٹتی ایک ایسی جنّتِ نگاہ بن جاتی ہے جس کی ہر روش میں مسرّتوں کے چشمے اُبلتے اور ہر تختے میں قہقہوں کے پھول کھلتے دکھائی دیتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ (۴۲/۲۸)

اور یہ اللہ ہی کی ذات ہے جو ایسی نا اُمیدیوں کے بعد اپنے سحابِ کرم کو بھیجتی اور اس طرح اپنی بساطِ رحمت کو صفحۂ ارض پر بچھا دیتی ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا ۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ (۷/۵۷)

اسی کی ذات ہے جو (زمین کے جُھلس جانے کے بعد) ان ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کو بھیجتی ہے جو اس کے ابرِ کرم کی پیشوائی میں ایک حیاتِ نو کی بشارت دیتی ہیں۔ پھر جب وہ ہوائیں پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو لے کر اُڑتی ہیں تو خدا کا قانون انہیں زمینِ مردہ کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے۔ وہاں ان بادلوں سے پانی برستا ہے جس سے، اُسی زمینِ مُردہ سے، ہر قسم کے پھول اور پھل پیدا ہو جاتے

ہیں اور ہر طرف زندگی کی نمود ہو جاتی ہے۔

فَانْظُرْ اِلٰٓی اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰہِ کَیْفَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا ؕ (۳۰:۵۰)

پس اگر تم آنکھوں میں بصارت کے ساتھ بصیرت بھی رکھتے ہو تو اللہ کے ان آثارِ رحمت کو دیکھو اور غور کرو کہ وہ زمین کو اس کی موت کے بعد کس طرح حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے۔

یہ فطرت کا نظام ہے۔ یہ اس کا قانون ہے جس کے قوانین اٹل اور جس کے آئین غیر متبدل ہیں۔ یہ اس کا قاعدہ ہے جس کے قواعد و ضوابط میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی، کہ تبدیلیاں زمان و مکاں کے تغیرات کا نتیجہ ہوتی ہیں اور اس کی ذات زمان و مکاں کی قیود سے ماوراء اور ان کے اثرات سے بے نیاز ہے۔

لیکن ان مادی تشبیہات و استعارات سے ہٹ کر ذرا دنیائے انسانیت کی طرف آئیے اور دیکھئے کہ وہاں بھی یہی اصولِ فطرت کس طرح عمل پیرا ہے۔ یہ مادی تشبیہات و استعارات بھی درحقیقت اسی مقصد کے لیے بیان کیے جاتے ہیں کہ انسان ان محسوسات کی راہوں سے مجرد حقیقتوں کی طرف آئے اور جو کچھ عالمِ آفاق میں ہو رہا ہے اس سے عالمِ انفس پر دلیل لائے۔ گزشتہ اوراق میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ آج سے چودہ سو سال پیشتر دنیائے انسانیت کی کیا کیفیت ہو چکی تھی۔ تاریخ کی یادداشتیں اس پر شاہد ہیں کہ اس وقت عالمِ انسانیت کی خشک سالی اس سے کہیں زیادہ شدید و مہیب تھی جس کا تشبیہی منظر اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔ اُس وقت شجرِ زندگی کی ہر شاخ سے نمی خشک ہو چکی تھی۔ تہذیب و تمدن کے پھول، وحشت و بربریت کی بادِ سموم سے مرجھا چکے تھے۔ حسنِ عمل کے زندگی بخش چشمے یکسر خشک ہو چکے تھے۔ زمین پر جو ہر انسانیت کی سرسبزی و شادابی کا کہیں نشان تک باقی نہ تھا۔ کشتِ مذاہب و اخلاق کے حدود تو باقی تھے لیکن فصلیں بالکل اُجڑ چکی تھیں۔ اس وحشت و سراسیمگی کے عالم میں، خاسر و نامراد انسان اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا تھا۔ لیکن خدا کی اس وسیع زمین پر اسے کہیں زندگی کا نشان اور تازگی کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ چاروں طرف سے مایوس اور نا اُمید ہو کر اس کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اُٹھتی تھیں اور ایک پکار سننے والے کو پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ ! یہ وقت تھا کہ فطرت کے اس اٹل قانون کے مطابق جس کی طرف اُوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، اس افسردگی و پژمردگی کو پھر سے تازگی و شگفتگی میں بدل دیا جاتا۔ چنانچہ اس کے لیے اس ربِ ذو المنن کا سحابِ کرم، زندہ اُمیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ہزار جنتیں اپنے آغوش میں لیے، ربیع الاوّل کے مقدس مہینے میں، فاران کی چوٹیوں پر جھوم کر آیا اور بلدِ امین کی مبارک وادیوں

میں کھل کھلا کر برسا، جس سے انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتیاں لہلہا اُٹھیں۔ اخلاق و تمدن کے پژمردہ پھولوں پر پھر سے بہار آگئی۔ عمرانیت و مدنیت کے سبزۂ پامال میں نزہت و لطافت پیدا ہو گئی۔ اعمالِ صالحہ کے خشک چشمے حیاتِ تازہ کے جوئے رواں میں تبدیل ہو گئے۔ طغیانی و سرکشی کی بادِ سموم، عدل و احسان کی جاں بخش نسیمِ سحری میں بدل گئی۔ فضائے عالم مسرتوں کے نغموں سے گونج اُٹھی۔ انسان کو نئی زندگی اور زندگی کو نئے ولولے عطا ہوئے۔ آسمان نے جھک کر زمین کو مبارک باد دی کہ تیرے بختِ بلند نے یاوری کی اور تیرے خوش نصیب ذرّوں کو اس ذاتِ اطہرؐ و اعظم کی پابوسی کی سعادت نصیب ہو گئی جو عالمِ موجودات کے سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی ہے، جس سے شرف و مجدِ انسانیت کی تکمیل ہو گئی، جو علم و بصیرت کے اس افقِ اعلیٰ پر جلوہ بار ہے جہاں عقل و عشق، فکر و نظر، دین اور دنیا قوسین کی طرح آپس میں ملتے ہیں، جو دانشِ نورانی اور حکمتِ برہانی کے اس مقامِ بلند پر فائز ہے جہاں غیب و شہود کی وادیاں دامنِ نگاہ میں سمٹ کر آجاتی ہیں۔ ہاں تو، آسمان نے خوش بخت زمین کی بارگاہِ عالیہ میں جھک جھک کر ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کیا۔ نوامیسِ فطرت نے "جنّت سے نکالے ہوئے آدم" کے اس طالعِ بیدار کا تقدیس و تحمید کے زمزموں سے استقبال کیا۔ دنیا سے طاغوتی قوتوں کے تخت اُلٹ گئے کہ وہ آنے والا آگیا جس کی آمد ملوکیت و قیصریت کے لیے پیغامِ فنا تھی۔ ایران کے آتش کدوں کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی کہ اب سے انسانی تصوّرات کی دُنیا نار کی جگہ نور سے معمور ہو گئی۔ دنیا کے صنم کدوں کے بُت پاش پاش ہو گئے کہ آج مسلکِ ابراہیمیؑ کی تکمیل کا دن آگیا۔ شیاطین نے پہاڑوں میں جا کر منہ چھپا لیا کہ اب جور و استبداد کی ہر طاغوتی قوّت کے رُوپوش ہونے کا وقت آگیا۔ دنیا سے باطل کی تاریکیاں دور ہو گئیں کہ آج اس آفتابِ عالمتاب کا طلوع ہُوا جس کے بھیجنے والے نے اُسے "جگمگاتا چراغ" کہہ کر پکارا اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (۳۳/۴۵-۴۶) آنے والا جس کی آمد کا مقصد یہ بتایا گیا کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) جب وہ آیا تو اس نے تمام اغلال و سلاسل کو ایک ایک کر کے توڑ دیا جن میں انسانیت جکڑی چلی آرہی تھی۔ احبار و رہبان کی تقلید کے اطواق و سلاسل، قیصر و کسریٰ کے استبداد کی زنجیریں، توہّم پرستی کی بصیرت سوز بندشیں، تقسیمِ انسانیت کے انسانیت کُش نسلی، جغرافیائی، وطنی، غیر فطری معیار، سب ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے اور پابندِ قفس طائرِ لاہُوتی کو پھر سے آزادی کی فضائے بسیط میں اِذنِ بال کشائی عطا ہوا اور انسان ایک مرتبہ پھر زمین پر سر اونچا

کر کے چلنے کے قابل ہو گیا۔ انسانیت کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی سیدھی راہ مل گئی۔ عقل کو عشق کا جنون اور عشق کو عقل کی فرزانگی عطا ہوئی۔ فقر کو شکوہِ خسروی اور پادشاہی کو استغنائے فاروقی عنایت ہوا۔ یہ تھی وہ ذاتِ گرامیؐ کہ

محبّت از نگاہش پائدار است
سلوکش عشق و مستی را عیار است
مقامش عبدہٗ آمد ولیکن
جہانِ شوق را پروردگار است

اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ج (۳۰:۵۰)

اِس طرح وہ دلوں کی مُردہ بستیوں میں پھر سے زندگی کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔

اِسی حقیقتِ باہرہ کو بانداز دِگر دیکھئے۔ آویزشِ ابلیس و آدم سے سلسلۂ رُشد و ہدایت کی ابتداء ہوئی۔ ابلیسانہ قوتوں کی تائید میں کشش و جاذبیّت کا وہ تمام نگاہ فریب سامانِ رنگ و تعطّر تھا جو نگارخانۂ طلسمِ حیات کے دامن میں بھر کر رکھ دیا گیا تھا۔ دوسری طرف انسانی راہ نمائی کے لیے پیغامِ ازلی تھا جو مبداءِ فیض کی شانِ ربوبیّت سے انسانوں تک پہنچتا رہا۔ عقلِ خود بیں طبیعیاتی زندگی ہی کو سفرِ حیات کی آخری منزل قرار دے کر، اعلیٰ مقاصد اور بلند اقدار کو اس کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتی تھی لیکن یہ پیغامِ ازلی اس کے سامنے طبیعیاتی زندگی کی آرائشوں کے ساتھ ساتھ شرفِ انسانیّت کی بلند حقیقتوں کو بے نقاب کرتا تھا۔ اس پیغام کی لِم ایک تھی، حقیقت ایک تھی، لیکن جوں جوں اس طلسم کدۂ رنگ و بُو کی پیچیدگیاں بے نقاب ہوتی جاتی تھیں، اس تعلیم کی جزئیات میں مناسب ردّ و بدل اور ضروری تغیّر و تبدّل ہوتا جاتا تھا، تاکہ طبعی ارتقاء کے ساتھ ساتھ جوہرِ انسانیّت میں بھی بتدریج ارتقاء ہوتا جائے۔ یہ ارتقائی مدارج تکمیل

کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رہروانِ شوق کا یہ کارواں سوئے منزل جادہ پیما تھا۔ ان پیغمبرانِ حیاتِ جاوید کا ہر ایک قدم ایک خاص سمت اُٹھتا اور ہر نشانِ راہ ایک آخری مستقر کی طرف اشارہ کرتا جاتا۔ چنانچہ آنے والوں میں سے جو کوئی اپنے منصب کی تکمیل کے بعد واپس جاتا تو جاتے وقت ایک آخری آنے والے کا پتا نشان بتا کر جاتا، کہ جب وہ آنے والا آئے تو یہ قافلہ بلا تأمل و توقف اس کے پیچھے ہو لے اور راہ گم کردہ، مختلف وادیوں میں سرگرداں و حیراں نہ پھرتا رہے۔ اس لیے کہ یہ سب ایک ہی سلسلۂ زرّیں کی مختلف کڑیاں تھیں جن میں کی ہر کڑی، سلسلہ کی آخری کڑی کی روشن دلیل تھی۔ یہ سب ایک ہی کتابِ فطرت کے اوراق و ابواب تھے جن میں کا ہر ورق اور ہر باب، کتاب کے آخری باب کی تمہید تھا۔ یہ سب ایک ہی شجرِ طیّب کی شگفتہ شاخیں تھیں جو ایک گلِ سرسبد کے لیے نویدِ بہار تھیں۔ چنانچہ جب مشیّتِ ایزدی کی یہ تدبیرِ محکم جس کے لیے زمین و آسمان قرنہا قرن سے یوں سرگرداں پھر رہے تھے، اپنی پختگی تک پہنچی، جب انسانیّت جس کے لیے کائنات نے ایک ایک ذرّے کو لاکھوں چکر دیئے تھے، گہوارۂ طفولیّت سے حریمِ شباب میں آگئی، جب اس صحیفۂ فطرت کی تکمیل کا وقت آگیا جس کے مختلف اوراق ستاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی مرمریں روشنی میں کوثر و تسنیم سے دُھلے ہوئے قلم سے لکھے گئے تھے، جب سینۂ کائنات میں اتنی کشادہ پیدا ہو گئی کہ وہ اپنے اندر رازہائے دَرُونِ پردہ کے معدنِ لعل و گہر کو سمو لے تو آسمان کی حوریں زمین پر اُتریں کہ جنّت کے تر و تازہ پھولوں سے وادیٔ بطحاء کی تزئین و آرائش کریں۔ صحنِ گلستانِ کائنات پر بہار آگئی۔ ہر طرف سے مسرّتوں کے چشمے اُبلنے لگے۔ چاند مسکرایا، ستارے ہنسے، آسمان سے نور کی بارش ہوئی، فرشتوں کی معصوم نگاہوں میں ۔ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ کی تفسیر ایک پیکرِ محبوبیّت کا حسین تصوّر بن کر چمکنے لگی۔ فلک تعظیم کے لیے جُھکا، زمین نے اپنی خاک آلود پیشانی سجدہ سے اٹھائی کہ آج اس کی قرن ہا قرن کی دعاؤں کی قبولیّت کا وقت آپہنچا تھا۔ صحرائے حجاز کے ذرّے جگمگا اُٹھے۔ بلدِ امین کی گلیوں کا نصیبہ جاگا کہ آج اس آنے والے کی آمد آمد تھی جس کی طرف جبلِ تین پر حضرت نوحؑ نے اشارہ کیا تھا اور جسے کوہِ زیتون پر حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو وجہِ تسکینِ خاطر بتایا تھا، جس کی آمد کی بشارتیں وادیٔ طورِ سینین میں بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں اور جس کے لیے دشتِ عرب میں حضرتِ خلیلِ اکبرؑ اور ذبیحِ اعظمؑ نے اپنے خدا کے حضور دامن پھیلایا تھا۔ وہ آنے والا کہ جس کے انتظار میں زمانہ نے لاکھوں کروٹیں بدلی تھیں، ۔ آیا اور اس شانِ زیبائی و رعنائی سے آیا کہ زمین و آسمان میں تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے۔ فرشتوں نے زمزمۂ تبریک گایا۔ سدرۃ المنتہیٰ کی حدود فراموش شاخوں

نے جھولا جھلایا۔ ملاءِ اعلیٰ کی مقدّس قندیلوں نے چراغاں کیا۔ کائنات کے ذرّے چمک اُٹھے۔ فضائے عالم صلوٰۃ وسلام کی فردوس گوش صداؤں سے گونج اُٹھی اور انس وجان وجد وکیف کے عالم میں پکار اُٹھے کہ

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا — اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
در جہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں — تو صلوٰۃِ صبح، تو بانگِ اذاں

یہ آنے والا رسولؐ کافۃ للنّاس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل وحریّت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی، اُسی کتابِ مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمدؐ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی، وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبویؐ میں اتاری گئی۔ مشامِ جاں نوازنے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی، وہ لالہ و یاسمن کی انہی پتّیوں کی رہینِ منّت تھی جن کا گلدستہ اس نبیٔ آخر الزّماںؐ کے مقدّس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدیؐ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدیؐ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذرّاتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غُلُوّ آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے، یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے، یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے، یہ مالا تھی۔ وہ پتّیاں تھیں، یہ پھول تھا۔ وہ ذرّے تھے، یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے، یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے، یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے، یہ ملّت تھی۔ وہ نقطے تھے، یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی، یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃٌ للعالمینؐ انتہاست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل

کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے، وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنھیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رو

یہ تھا حاصلِ بہارِ چمنِ کائنات، کہ جس کا ظہور صبحِ بہارِ کائنات تھا۔

وہ رازِ خلقتِ ہستی، وہ معنیٔ کونین
وہ جانِ حسنِ ازل، وہ بہارِ صبحِ وجود
وہ آفتابِ حرم، نازنینِ کنجِ حرا
وہ دل کا نور، وہ اربابِ درد کا مقصود
وہ سرورِ دوجہاں وہ محمدِ عربیؐ
بروحِ اعظم و پاکش درودِ لامحدود!

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا
(۳۳/۵۶)

(اقتباس از معراجِ انسانیت، تصنیف علامہ پرویز علیہ الرحمہ)

پرویز علیہ الرحمۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ آلِ عمران، آیات 1 تا 8

درسِ قرآن

الٓمّٓ ﴿۱﴾ اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ﴿۲﴾ نَزَّلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ وَ اَنۡزَلَ التَّوۡرٰىۃَ وَ الۡاِنۡجِیۡلَ ﴿۳﴾ مِنۡ قَبۡلُ ہُدًی لِّلنَّاسِ وَ اَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ لَہُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ؕ وَ اللّٰہُ عَزِیۡزٌ ذُو انۡتِقَامٍ ﴿۴﴾ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخۡفٰی عَلَیۡہِ شَیۡءٌ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ ﴿۵﴾ ہُوَ الَّذِیۡ یُصَوِّرُکُمۡ فِی الۡاَرۡحَامِ کَیۡفَ یَشَآءُ ؕ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۶﴾ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ مِنۡہُ اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ ہُنَّ اُمُّ الۡکِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِہٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَہَ مِنۡہُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَۃِ وَ ابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِہٖ ۚ وَ مَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ ۘ وَ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِہٖ ۙ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا یَذَّکَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿۷﴾ رَبَّنَا لَا تُزِغۡ قُلُوۡبَنَا بَعۡدَ اِذۡ ہَدَیۡتَنَا وَ ہَبۡ لَنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ رَحۡمَۃً ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡوَہَّابُ ﴿۸﴾

عزیزانِ من! آج ستمبر 1969ء کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ آلِ عمران (تیسری سورۃ) کی پہلی آیت سے ہوتا ہے۔

حروفِ مقطعات کی بنیادی خصوصیات:

الٓمّٓ ﴿۱﴾ اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ﴿۲﴾ (3:1-2) الم ہی سے سورۃ بقرہ کی بھی ابتدا ہوئی تھی اور حروفِ مقطعات کے سلسلے میں جیسا کہ اب آپ کو معلوم ہے میری بصیرتِ قرآنی کے مطابق یہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہی کی ABRIVIATION کے الفاظ ہیں۔ جیسا کہ میں نے شروع میں تفصیل سے عرض کیا تھا عربوں کے ہاں یہ قاعدہ تھا اور دوسری زبانوں میں بھی یہ ہے کہ وہ لفظوں کا ایک حرف لے کر اس حرف کو پورے لفظ کا مطلب لے لیتے ہیں۔ یہ RSVP وغیرہ آپ کے ہاں انگریزی میں اس طرح بولتے ہیں یہ بالکل وہی چیز ہے۔ عبرانی زبان میں بھی یہ انداز تھا عربی زبان میں بھی یہ انداز تھا اور قرآن تو لسانِ عربیٔ مبین میں نازل ہوا ہے اس لیے قرآنِ کریم کو سمجھتے وقت اس چیز کو نظر انداز نہ کیجیے کہ عربی زبان کا جو انداز بیان تھا وہی اندازِ بیان قرآن میں بھی ملحوظ رکھا گیا ہے اور یہ ان کے ہاں کی ایک چیز تھی۔

الٓمّٓ ① (3:1) یعنی خدائے علیم وحکیم۔ اور یہ ضروری نہیں کہ پہلا ہی حرف ضرور یہ لیتے تھے اس میں کوئی حرف وہ لے لیتے تھے لیکن وہ ہوتا تھا ایسا کہ جس سے ذہن فوراً اسی طرف منتقل ہوجاتا تھا۔ الٓمّٓ ①: خدائے علیم وحکیم کا ارشاد ہے۔ یہ جو آیت ہے اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ② سورۃ بقرہ میں بھی آ چکی ہوئی ہے (2:255) میں یہی الفاظ ہیں اور اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ یا اِلَّا اللّٰہُ یہ تو بنیاد ہے قرآن کی پوری تعلیم کی یعنی کائنات میں کوئی صاحبِ اقتدار نہیں' کسی کا قانون نہیں چل سکتا۔ یہ نفی ہے جس میں ہر قسم کے اقتدار کی تردید کی گئی ہے۔

آزاد انسانوں کی معاشرتی زندگی میں الٰہ کی طرف سے کنٹرول اور اقدار کی اہمیت:

آپ سوچیے کہ اس سے انسان کو کتنی عظیم آزادی حاصل ہوتی ہے کہ کسی شخص کا اقتدار کسی شخص کے اوپر نہیں۔ یوم الدین کے متعلق جیسا قرآن میں یہ کہا ہے کہ یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا (82:19) کہ جس دور میں کسی شخص کا کسی دوسرے کے اوپر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اتنی سی چیز ہو تو یہ تو منفیانہ انداز ہے NEGATIVE چیز ہے یہ تو انارکی ہے اس سے تو کام نہیں چل سکتا اس لیے اگلی چیز اس کے ساتھ ہی وہ اضافہ کر کے اس کی تکمیل کی اِلَّا اللّٰہُ۔ وہی جو آیت میں نے ابھی تلاوت کی اس کا ٹکڑا جو ہے کہ اس دور میں کوئی کسی کا دبیل نہیں ہوگا اس کے آگے ہے وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ ﴿۱۹﴾ (82:19) یہ نہیں ہوگا کہ وہاں انارکی ہوگی کسی قسم کا قاعدہ ہی نہیں قانون ہی نہیں' انسانوں کا کوئی اقتدار کسی دوسرے انسان پہ نہیں ہوگا۔ وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ ﴿۱۹﴾ (82:19) اس دور میں تمام امور کے فیصلے خدا کے قوانین کے مطابق ہونگے۔ یہی وہ چیز ہے کہ جو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے اندر پوشیدہ ہے کوئی صاحبِ اقتدار نہیں لیکن LAWLESSNESS نہیں ایک صاحبِ اقتدار ایک قانون دینے والا اسی کے قانون کی اطاعت اور وہ انسانوں سے بالاتر ہستی ہے۔ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ② (3:2) زندہ اور زندگی عطا کرنے والا' قَیُّوْمُ کے معنی ہیں ''جو خود اپنے قیام کے لیے اپنے وجود کے لیے اپنی EXISTENCE کے لیے کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو' اور ہر ایک کے قیام کا ذمہ دار ہو' ہر شے اس کی وجہ سے وجود کو شش ہو یا وجود پذیر ہو اور وہ خود اپنی ذات کے لیے اپنے وجود کے لیے کسی کا محتاج نہ ہو۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا عربی زبان ایسی جامع ہے کہ اس میں ذرا سا باب بدل دیا جائے تو اس باب میں نئی قسم کی ایک جامعیت آ جاتی ہے۔ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ زندگی اور اس کے بعد قیام بڑی ضروری چیزیں ہیں۔ زندگی اس نے عطا کی یہ جو قیام ہے خارجی کائنات میں خدا کا قانون جاری وساری ہے اس کے مطابق ہر شے کا قیام ہے اس کی EXISTENCE ہے وہ موجود ہے وہ باقی رہتی ہے۔ انسانوں کی دنیا کے اندر بھی اس قانون کی ضرورت تھی انسان کی طبعی زندگی کے لیے تو وہی قوانین جو خارجی کائنات میں کارفرما ہیں انہی کے تابع اس کی طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) چلتی ہے لیکن اس نے انسان کو حیوانی سطح سے اونچا لے جا کے ایک انسانی زندگی بھی اس کی بتائی ہے وہ انسانی زندگی کہ جس میں اس نے متمدن زندگی بسر کرنی ہے۔

مادی شعبۂ زندگی میں ذاتِ انسانی کی نشوونما کے لئے حق کا قیام ضروری ہے:

متمدن زندگی میں ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ جب واسطہ پڑتا ہے اس میں ایسے قوانین کہ جن سے اتنا ہی نہیں کہ یہ مدنیت کی زندگی میں آپس میں ٹکراؤ نہ ہو تصادم نہ ہو بلکہ باہمی تعلقات سے ہر فرد کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جائے ۔ یہ ہے انسانی سطح زندگی اور اس کے لیے جو قوانین اس نے عطا کیے وہ وحی کے ذریعے خصوصیت سے انسانوں کے لیے عطا کیے۔ اس لیے جب اس نے اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (3:2) کہا زندگی اور EXISTENCE قائم رہنے کی صفت بیان کی تو سطح حیوانی سے بلند ہو کر انسانوں کو انسان کی سطح پہ خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس مقصد کے لیے نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ (3:3) ہم نے اے رسول تیری طرف یہ کتاب بتدریج نازل کی حق کے ساتھ۔ جیسا کہ آپ کو اب معلوم ہے قرآن کی بڑی جامع اصطلاح ہے حق ٹھوس حقیقتیں THE TRUTH' ایک ذہنی قیاسی چیز نہیں یونہی ABSTRACT نہیں اس کے لیے بنیادی طور پہ محسوس ٹھوس حقیقتوں کا ہونا اور دوسری چیز ان حقیقتوں کا زمانے کے تقاضوں کے لیے جن ضرورتوں کے لیے وہ چیزیں دی جاتی ہیں ان میں FIT IN ہو جانا۔ پہلے دروازے میں ایک چول ہوتی تھی اس کے نیچے ایک ساکٹ ہوتا تھا یہ جس طرح سے کہ وہ اس کی چُول اس ساکٹ کے اندر فٹ ہوتی ہے لیکن فٹ جامد طور پہ نہیں ہوتی ایک تو آپ گاڑ دیتے ہیں نا کوئی چیز وہ بھی فٹ ہوتی ہے لیکن اس میں جمود ہوتا ہے۔ ایسی چیز کہ جو کسی دوسرے میں فٹ تو آئی ہو لیکن اس کی حرکت کے راستے میں وہ مزاحم نہ ہو پائے اس کو الحق کہتے ہیں۔ دیکھتے ہیں یہ زبان کیا تھی ان کی۔ دروازے کی موومنٹ بھی پوری پوری رہتی ہے اور وہ اپنے مقام سے ہل بھی نہیں سکتا ذرا سا اس مقام سے اس کو ہلا دیجیے دروازہ دروازہ نہیں رہتا جامد ہو جائے تو نہیں رہتا وہاں سے اگر ذرا ادھر اُدھر ہٹ جائے پھر وہ دروازہ نہیں رہتا۔

آج کرۂ ارض پر انسانوں کے لیے وحی کی خصوصی تعلیم، قرآنِ حکیم کے سوا کسی جگہ موجود نہیں:

نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ (3:3) عزیزانِ من! یہ قرآن ہی کی عظمت ہے قرآن ہی کی میں نے اس لیے کہا کہ زمانۂ نزولِ قرآن میں اور اس کے بعد بھی اس سے پہلے جتنی کتابیں آسمانی آئی تھیں وہ اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہی تھیں۔ اس لیے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں خصوصیت صرف قرآن ہی کی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ پہلی دفعہ خدا نے یہ بات اس میں کہی ہے۔ اس سے پیشتر حضراتِ انبیائے کرامؑ کی وساطت سے جو خدا کی تعلیم آتی رہی وہ اساسی طور پر اصولاً وہی تھی جو قرآن کے اندر ہے لیکن وہ اپنی اصلی شکل میں باقی نہ رہی۔ اس لیے جب ہم کہتے ہیں کہ قرآن ہی کی خصوصیت ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب یہ خصوصیت کسی اور جگہ نہیں ملتی۔ اور وہ خصوصیت جس کی طرف میں اشارہ کر رہا تھا وہ یہ کہ دنیا میں آپ دیکھیں گے ہر اہلِ مذہب یہ کہتا ہے کہ سچائی صرف ہماری طرف آئی تھی کسی اور کی طرف نہیں آئی تھی اور یہ قرآن ہے جس نے یہ کہا کہ نہیں! دنیا کی ہر قوم میں ہر زمانے میں ہماری طرف سے رسول آتے رہے اور

وہ ہماری طرف سے وہی تعلیم لاتے رہے جو تعلیم اب اصولی طور پر قرآن کے اندر تمہیں ملے گی۔ اور اسی لیے اس نے یہ کہا کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے سے پہلے ضروری ہے کہ تم ایمان لاؤ تمام انبیاؑ کے اوپر جو ان سے پہلے آ چکے ہیں۔ اور اس حیثیت سے ایمان لاؤ کہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (2:285) ان کے رسول ہونے کی حیثیت سے ہم ایک دوسرے میں قطعاً کوئی تفریق نہیں کرتے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ دیگر اہلِ مذاہب کے بانیوں کی تعظیم و تکریم و احترام ایمان کی حد تک۔ جو میں نے کہا تھا کہ قرآن کے باہر کہیں نہیں ملے گی یہ بات کہیں نہیں ملے گی کس قدر وسعتِ ظرف ہے کس قدر کشادگیٔ نگاہ ہے۔ اور یہ نہیں کہ کسی پر احسان رکھ رہے ہیں ایسا کہنے سے ایک حقیقت کا اظہار ہے خدا کی طرف سے کہ جب ہماری ہی طرف سے یہ تمام انبیاؑ آئے تھے اس سلسلے کی آخری یہ رسول ﷺ ہے تو پھر تو ہر نبیؑ کو نبی ماننا ہوگا رسولوں پہ ایمان لانا ہوگا اس حیثیت سے کہ کسی رسول کی رسالت کے منصب میں تم کسی قسم کا فرق نہ کرو۔ لہٰذا ان کی طرف جو کتابیں نازل ہوئیں ان کو بھی ماننا ہوگا کہ وہ اپنے اپنے وقت میں خدا کی طرف سے آئی تھیں۔

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں تصریفِ آیات کا انداز ایک خاص تدریسی مصلحت کے تحت اپنایا ہے:

اب یہاں مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (3:3) پہلے بھی یہ بات آ چکی ہے لیکن چونکہ درس میں نئے نئے احباب بعد میں بھی آتے ہیں اس لیے جب بھی اس قسم کی چیزیں آتی ہیں میں انہیں پھر دہرا دیا کرتا ہوں۔ جو پہلی دفعہ تشریف لاتے ہیں ان کے لیے یہ بات پہلی دفعہ سامنے آتی ہے جو التزاماً تشریف لا رہے ہیں ان کے لیے یہ بات مکرر ہو جائے گی۔ قرآن نے تو خود اپنا انداز تصریفِ آیات کہا ہے بار بار لوٹا لوٹا کر باتیں بیان کرتا ہے وہ۔ جیسا میں نے کہا تھا درس تو کہتے ہی اسی کو ہیں وہ جو گاہنا ہوتا ہے اناج کو بار بار بیل چلائے جاتے ہیں تا آنکہ وہ دانہ سٹوں سے خوشوں سے نکل کے باہر آ جائے۔ اس لیے اگر یہ چیزیں دہرائی جائیں تو یہ طریق قرآن کے عین مطابق ہوتا ہے۔

لغت کے تحت لفظ مصدق یا تصدیق کا قرآنی مفہوم:

ہمارے ہاں مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (3:3) ترجمہ ہمارے ہاں کیا جاتا ہے ''یہ تصدیق کرتی ہے ان کتابوں کو جو ان لوگوں کے پاس ہیں''۔ آپ سوچیے کہ یہ چیز ایک لفظِ تصدیق عربی زبان میں ہو تو پھر تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ ہمارے ہاں تصدیق کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو CONFIRM کر دینا اس کو APPROVE کر لینا اس کی تصدیق کر دینا کہ یہ ٹھیک ہے سچی ہے یہ بات۔ اور تورات و انجیل یہی دو کتابیں تھیں نا اس زمانے میں ان لوگوں کے سامنے کم از کم۔ ان میں تحریف کے متعلق خود قرآنِ کریم بار بار یہ کہتا ہے کہ اپنی اصلی شکل میں وہ نہیں رہیں۔ تو اب جو چیز قرآن کے نزول کے وقت اپنی حقیقی شکل میں نہیں تھی اس کے متعلق اگر ہم یہ کہیں کہ قرآن ان کے سچے ہونے کی تصدیق کرتا ہے تو یہ چیز تو SELF CONTRADICTORY ہو جائے گی یہ تو قرآن خود اپنی تردید کر رہا ہوگا کہ ایک طرف ان کو محرف کہہ رہا ہے دوسری

طرف انہی کتابوں کی سچائی کی تصدیق کر رہا ہے۔ یہ مصدق تصدیق کرنے کے معنی ہوتا ہے کسی بات کو سچ کر دکھانا۔ جو دعاوی ان کتابوں کے تھے جو تعلیم ان کتابوں کی تھی اب یہ قرآن اور اس کا لانے والا ان دعاوی کو سچ کر دکھائے گا۔ کم از کم ایک چیز تو تورات اور انجیل کیا دنیا کی ہر کتاب میں موجود ہے اور وہ یہ کہ ایک دور بہر حال آنے والا ہے جس میں حق کا نظام قائم ہوگا باطل مغلوب ہوگا۔ دنیا کے ہر اہلِ مذہب اس چیز پر ان کے ہاں ان کی کتابوں میں یہ چیز موجود ہے اور اس کے لیے وہ انتظار کر رہے ہیں کسی آنے والے کا ایک آنے والا آئے گا اور وہ ان دعاوی کو سچ کر دکھائے گا جو ان پہلی کتابوں میں تھے۔ اور یہ دعویٰ تو بنیادی ہے اور میں کہتا ہوں دعویٰ ہی یہی ہے کہ دنیا میں غلط نظام جو ہے اس کی جگہ حق کا نظام قائم کیا جائے۔ کتابوں میں ان کے یہ چیز تھی وہ کتابیں یہ نہیں بتاتی تھیں کہ یہ کس طرح سے کیا جائے گا اس کے لیے انہوں نے یہ عقیدہ وضع کیا تھا ایک آنے والا آئے گا اور وہ کر دکھائے گا۔

دیگر مذاہب والوں کے نزدیک کسی ایک آنے والے کا تصور اور اس کی حقیقت:

یہ جو چیز تھی کہ جس تعلیم کو عملاً متشکل کرنے کے لیے یہ لوگ ایک آنے والے کا انتظار کر رہے ہیں وہ آنے والا اب آ گیا ہے۔ یہ قرآن آیا اور قرآن کا لانے والا آ گیا اب یہ ان کے ان دعاوی کو جس کے انتظار میں وہ اتنا عرصہ سے چلے آ رہے ہیں یہ اپنے ہاتھوں سے اس کو سچ کر دکھائے گا یہ ہے مصدق ہونا ان چیزوں کا۔ وہ آنے والا آیا اور اس نے فی الحقیقت ان چیزوں کو سچ کر دکھایا۔ اب یہ ان کی تنگ نظری تھی اہلِ مذہب کی کہ اس کے باوجود انہوں نے اس آنے والے کو وہ آنے والا نہ سمجھا۔ اور یہ تنگ نظری حضور ﷺ کے سلسلے میں ہی پیدا نہیں ہوئی حضرتِ عیسیٰؑ تو بنی اسرائیل میں سے تھے اور بنی اسرائیل انتظار کر رہے تھے ایک آنے والے مسیح کا کہ جس کے ہاتھوں وہ نظام قائم ہوگا۔ آنے والا وہ مسیح آیا اس نے ان سے کہا آ کے کہ جن باتوں کا تم انتظار کر رہے ہو میں انہیں سچ کر کے دکھاؤں گا آ گیا ہوں میں۔ اور انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس کی تائید کی ہو اس کی جان تک کے لاگو ہو گئے یہ ہے وہ تنگ نظری۔ یہ بات ذرا لمبی ہے کہ پھر یہ اس طرح سے آنے والے کا انتظار بھی کرتے ہیں اور آنے والے کی تردید اور مخالفت کیوں کرتے ہیں؟ ایک فقرے میں یہ دیکھیے کہ انتظار تو یہ کراتے ہیں یہ مذہبی پیشوائیت جو ہے اگر یہ تسلیم کر لیں کہ یہ وہ آ گیا ہے جس کے ہاتھوں سے ہوگا تو ان کی چوہدراہٹ ختم ہو جاتی ہے کبھی نہیں مان کے دیں گے۔ دوسری طرف جانے نہیں دیں گے آنے والے کے انتظار کے عقیدے سے کہ وہ تمہارے ہی ہاں آنا ہے آنے والے کو مان کے نہیں دیں گے کہ خود ختم ہوتے ہیں۔ یہی چیز نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں ہوئی۔ بہر حال یہ بات دوسری ہے۔

ہمارے ہاں کسی آنے والے کے متعلق پایا جانے والا تصور اور پھر اس کا نتیجہ:

ضمناً یہ کہ وہ آنے والا آ بھی گیا آخری کتاب لے آیا آخری رسول بھی آ گیا اب آنے والے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ لیکن اس قوم نے بھی پھر تھوڑے عرصے کے بعد وہی تصور قائم کر لیا جو پہلے چلا آ رہا تھا کہ اب ایک اور آنے والا آئے گا اب

اس میں پھر ایک آنے والا ان کے ہاں بھی آئے گا۔ اللہ اکبر۔ یعنی جو کچھ پہلی قوموں نے کیا حرفاً حرفاً وہی کچھ اس قوم نے کیا۔ ہم الزام دیتے ہیں یہود کو کہ آنے والا مسیح ان کے ہاں آیا اور انہوں نے اس کی مخالفت کی اور آنے والا کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم الزام دیتے ہیں عیسائیوں کو کہ آنے والے کا ان کے ہاں یہ عقیدہ موجود ہے آنے والا محمد رسول اللہ ﷺ کی شکل میں اور انہوں نے اس کی مخالفت کی اور آنے والا کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور اپنی ہماری یہ حالت ہے کہ خود جسے ہم کہتے ہیں کہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک آنے والا تھا آ گیا اس آ جانے کے بعد ہم پھر آنے والے کا انتظار کر رہے ہیں عجیب بات ہے۔ کہیں نزولِ مسیح کی شکل میں کہیں کوئی نبوت کی شکل میں کہیں مجددوں کی شکل کے اندر آنے والے کا انتظار وہ آئے گا اور سچ کر کے دکھائے گا۔ قوم بیٹھی ہے ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے۔ جتنی انتظار کرنے والی قومیں تھیں انہوں نے کچھ نہ دنیا میں کر کے دکھایا انتظار جو یہ ہے کہ اس نے آ کے کرنا ہے ہم نے تو کچھ کرنا ہی نہیں ہے۔

ختمِ نبوت ﷺ کی حقیقت تو کسی بھی صورت کسی آنے والے کے تصور کو قبول ہی نہیں کرتی:

ختمِ نبوت ﷺ کے معنی یہ تھے کہ ہر قسم کا انتظار جو ہے ختم کر دیا جائے شخصیتوں کا دور ختم ہو گیا۔ ہم نے پھر سے ؎

ز ذوقِ بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا

وہ سارے عقیدے ان لوگوں سے مستعار لے لے کے اپنے ہاں بھی یہ سب۔ اب بیٹھے ہاں صاحب انتظار کر رہے ہیں کوئی سو سو برس کا انتظار کرتا ہے کہ مجدد آئے گا کوئی آخری دور کا انتظار کر رہا ہے کہ مہدی آئے گا کوئی آسمان سے اترنے والے کا انتظار کر رہے ہیں۔ آنے والا ﷺ آ گیا اور اس کے باوجود اس کی قوم پھر انتظار کر رہی ہے دوسروں کو دوش دے رہی ہے کہ وہ تو آ گیا تھا جس کے تم انتظار میں تھے تم کیوں انتظار کرتے ہو؟ تم کیوں کرتے ہو! ہمیں انتظار کرنے دو ''اوتسی بہتر اکر چکے ہیگے او'' (تم بہت کر چکے ہو)۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (3:3) آ گیا وہ ضابطۂ قانون۔ عزیزانِ من! قرآن کی عظمت ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کا نظام انسانی ہاتھوں سے متشکل ہونا تھا متشکل ہوا بھی انسانوں کے ہاتھوں سے محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ کے ہاتھوں سے۔ لیکن قرآن نے جہاں مصدق کی چیز کہی ہے وہ ضابطۂ قانون ہی کو کہا ہے یہ اس لیے کہ کہیں یہ نہ ہو جائے کہ وہی تھے جنہوں نے یہ کر کے دکھا دیا جب وہ چلے گئے تو اس کے بعد پھر اب معاملہ ختم ہو گیا اب پھر کسی شخصیت کا انتظار کرو۔ ضابطہ موجود ہے جو بھی اٹھ کے اس ضابطے کے مطابق عمل کرے گا وہ اس نظام کو متشکل کر دے گا۔ سوال ہی انتظار کا نہیں ہے سوال تو صرف عمل کرنے کا ہے جو بھی یہ کرے گا۔ اور اس کی تو کیفیت یہ ہے (پھر بات بڑھ جائے گی) یہ قرآن جو ہیں یہ تو ازلی حقائق ہیں جیسے بکھرے ہوئے ہوتے ہیں اس کے لیے بھی یہ ٹھیک ہے کہ ایک جماعت ایک امت یہ اٹھے گی تو پورے قرآن کو لے کے اٹھے گی لیکن قرآن کی حقیقتوں میں سے اگر کوئی الگ الگ بھی کوئی قوم دنیا کی لے کے اس کو اٹھے گی اس پہ عمل کرے گی اس کے نتائج ملیں گے اس کو خدا اس قدر تنگ نظر نہیں واقع ہوا۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (3:3) اور اس سے پیشتر وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ (3:3-4) کتنی کشادہ نگہی ہے اس سے پیشتر ہم نے تورات نازل کی انجیل نازل کی نوعِ انسانی کے لیے اس میں بھی ہدایت تھی۔

ذاتِ رسول ہو یا ذاتِ نبوّت' کتاب لانے کی تو دونوں ہی حامل ہوتی ہیں:

تورات کے متعلق یہ عرض کر دوں قرآنِ کریم میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ تورات وہ کتاب تھی جو حضرتِ موسیٰؑ پر نازل ہوئی ہے کتابِ موسیٰؑ کا ذکر ہے اور وہ کتاب بھی حضرتِ موسیٰؑ اور حضرتِ ہارونؑ ان دونوں کو ملی تھی۔ وہ جو ایک دلیل لایا کرتے ہیں نا نبی بغیر کتاب کے اندازہ لگایے کیا کیا چیزیں ہمارے ہاں پیدا ہوگئی ہیں کہ جی رسول وہ ہوتا ہے جو کتاب لاتا ہے نبی وہ ہوتا ہے جو کتاب نہیں لاتا۔ کیا کرنے آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا۔ دلیل کیا ہے؟ کہ جی دیکھیے حضرتِ ہارونؑ نبی تو تھے کتاب نہیں لائے۔ قرآنِ کریم میں کم از کم دو مقامات پہ تو ایسا ہے جہاں حضرتِ موسیٰؑ اور ہارونؑ دونوں کا نام لے کے کہا ہے کہ ہم نے دونوں کو کتاب دی تھی۔ دعوے ہیں آسمانی علموں کے اور کیفیت یہ کہ قرآن کی دو آیتیں بھی سامنے نہیں ہیں جہاں سے یہ دیکھا جا سکے کہ قرآن نے خود بتا دیا۔ حالانکہ بظاہر نظر آ گیا کہ اس تصریح کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ تو خدائے علیم ہے نا وہ تو جانتا ہے نا کہ کس کس چور دروازے سے آنا ہے انہوں نے۔ بہرحال تورات اس کتاب کا نام نہیں جو حضرتِ موسیٰؑ کو ہی ملی یہ مجموعہ ہے ان کتابوں کا جو انبیائے بنی اسرائیل کو ملی تھیں۔ آج بھی OLD TESTIMON کے نام سے جو آپ کے ہاں مجموعہ ہے کتابوں کا وہ سارا ان تمام کتابوں کا مجموعہ ہے بس اتنا سا فرق ہے کہ قرآن نے ایک دو مقام پر حضرتِ داؤدؑ کی کتاب کا الگ ذکر کیا ہے کہ انہیں ہم نے کتاب دی تھی۔ زبور کتاب ہی کو کہتے ہیں۔

تورات کے علاوہ حضرت عیسیٰؑ کے سلسلہ میں موجودہ انجیل کی وضاحت:

بہرحال تورات مجموعہ انبیائے بنی اسرائیل پر جو کتابیں نازل ہوئی تھیں ان کا۔ اور اس کے بعد آخری انبیائے بنی اسرائیل میں سے جو نبی حضرتِ عیسیٰؑ آئے ان کی کتاب چونکہ الگ ہمارے پاس موجود ہے والانجیل اس کا ذکر الگ کیا۔ اور موجودہ انجیل بھی حضرتِ عیسیٰؑ پر نازل شدہ کتاب نہیں ہے وہ تو حضور ﷺ کے بعد انؑ کی بائیوگرافی ہے انؑ کی سیرت ہے انؑ کے اقوال ہیں جو ان کے حواریوں نے اور دوسرے لوگوں نے جمع کیے اور اتنا ہی نہیں پھر اس کے بعد تو پولوس کے خطوط اور بہت سی چیزیں اس میں ہیں۔ لیکن قرآن انجیل اسے ہی کہے گا کہ جو حضرتِ عیسیٰؑ پر خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھی۔ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ (3:4) اور آخر الامر الفرقان بھی آ گیا حق اور باطل میں اس طرح تمیز کر دینے والا جیسا میں نے آپ سے کہا تھا فرقان فرق مانگ جیسے نکالی جاتی ہے بالوں کی' ایک بال بھی مانگ میں سے ادھر کا ادھر ہو جائے مانگ ٹیڑھی ہو جاتی ہے اس طرح نکھار کر حق اور باطل میں تمیز کرنے والا جیسے بال بال الگ ہو جائے۔ یہ قرآن کی خصوصیت بتائی ہے ایک صفت بتائی ہے (25:1) میں اس میں یہ کہا ہے کہ خدا نے الفرقان نازل کیا ہے یہاں بھی وَاَنْزَلَ

الْفُرْقَانَ (3:4) ہے۔ اب الفرقان جو ہے وہ صرف قرآن ہے حق اور باطل میں تمیز کرنے والا۔ یاد رکھیے بنیادی طور پہ حق اور باطل ہے اس میں تمیز کرنے والا صرف قرآن ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ (3:4) اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ ''جو لوگ قوانینِ خداوندی سے انکار کرتے ہیں ان کے لیے عذابِ شدید ہے۔

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق اور کافر اور عذاب کے الفاظ کا مفہوم:

میں نے گذارش کیا ہے کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے اس کی یہ جو TECHNICAL TERMS ہیں نا CONCEPTS جو ہیں ان کا مفہوم متعین کرنا بڑا ضروری ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (3:4) ہم نے کہا اور ذہن میں آ گیا جی! کافر جو ہیں نا ان پہ اور پھر کافر ہمارے ذہنوں میں آ جاتا ہے ہمارے سوا باقی سب۔ اب اس کی تو جرآت کوئی نہیں کرتا کہ قرآن سے اگر ہم نے کفر کے معنی متعین کیے تو سب سے بڑے کافر خود ہی کہیں نہ نکلیں کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتے ہیں لیکن آنکھیں بند کرنے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔ یہ تو قانون ہے کہیے کہ آگ نہیں جلاتی ڈالیے اس میں انگلی کہتے چلے جایے نہیں جلاتی آپ کے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ جو بھی انکار کرے گا قوانینِ خداوندی کا۔ پھر آیات اللہ کے معنی قرآن کی آیتیں ہی صرف لے لیں' آیات اللہ تو قوانینِ خداوندی ہیں۔ جو بھی قوانینِ خداوندی کی صداقت کا انکار کرے گا جو بھی یہ کہے گا کہ نہیں! سنکھیا ہلاکت نہیں کرتا اور پھانک لے گا لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ (3:4) اب اگلی چیز عذاب کی ہمارے ہاں آ گئی جونہی قرآن میں عذاب آتا ہے نظر آتا ہے کہ اللہ میاں کی طرف سے بس وہ کوئی مقرر ہیں ہنٹر لیے ہوئے قرآن کی آیتوں کا کسی نے انکار کیا یعنی ایمان اس پہ نہ لایا اور وہ وہاں سے ہنٹر برسانے والے آ گئے مار مار کے کھال ادھیڑ دینے والے۔ عذاب کے معنی ہمارے ہاں دیکھا نا اردو میں یہ عذاب ترجمہ تو سزا کیا جاتا ہے لیکن آپ دیکھیے اس میں ٹارچر کا مفہوم ہوتا ہے اس قدر عذاب دیا اس کو صاحب! توبہ توبہ توبہ ''عذاب کی زندگی'' آپ دیکھ رہے ہیں اس میں کیا مفہوم ہوتا ہے خالی سزا ہی نہیں ہوتا ٹارچر ہوتا ہے اور پھر عذابِ شدید عذابِ الیم تو خدا کے متعلق یہ تصور آتا ہے تو کانپ جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک تو ٹارچر کا تصور ہی نہیں ہے:

مقصد ہی یہ ہوتا ہے مذہبی پیشوائیت کا کپکپا دیا جائے ان کو ڈرا دیا جائے تاکہ اس کے بعد اس کے بعد وہی جو اس ٹارچر سے چھوٹنے کے لیے کیا جاتا ہے ''دے پیسے'' آپ دیکھتے ہیں ہر رلا دینے والی وعظ کے بعد ''دے پیسے! ہونداے''۔ (پیسے دو! ہوتا ہے)۔ عزیزانِ من! قرآن کے CONCEPTS (تصورات) کو سمجھئے۔ خدا کی طرف سے ٹارچر کی بات نہیں ہے خدا' یہ نہیں کہ وہ بیٹھا ہوا ہے' اس کو غصہ آ رہا ہے کہ او! میری آیت سے تُو نے انکار کیا! پکڑ لو' مار مار کے بھرکس نکال دو۔ قرآن تو اللہ کا تصور یہ دیتا ہے کہ جس نے بھی قانون کی صداقت سے انکار کیا اس کے نتائج نہایت تلخ تباہ کن اور نقصاں رساں اٹھائے گا۔ بات ختم ہوگئی۔ عذاب تو نتائج ہیں' قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کرنے کے ضرر رساں نتائج۔ کوئی آج کر کے

دیکھ لے یہاں سامنے نظر آ جائے گا۔ عزیزانِ من! وہ کوئی پولیس کانسٹیبل حوالات میں لے جا کر عذاب نہیں دے رہا بلکہ وہ اس عمل کا فطری نتیجہ ہے۔ اسے کہتے ہیں قانون سے سرکشی انکار کرنے کا نقصان رساں نتیجہ۔

قوانینِ خداوندی سے سرکشی کا نام صرف انکار ہی نہیں بلکہ کفر بھی کہلاتا ہے:

کفر کے معنی زبانی انکار ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کے معنی سرکشی ہوتا ہے۔ قانون سے سرکشی برتو گے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ نہایت تباہ کن، نہایت نقصان رساں، تباہیاں اور ہلاکتیں آ جائیں گی۔ جو بھی یہ کرے گا اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا (3:4) جو بھی ایسا کرے گا لَہُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ؕ وَاللّٰہُ عَزِیۡزٌ ذُو انۡتِقَامٍ (3:4)

لفظ عَزِیۡزٌ کا قرآنی مفہوم:

قانون کے پیچھے جب تک POWERFUL AUTHORITY نہ ہو، کوئی قوتِ نافذہ نہ ہو قانون وعظ بن کے رہ جاتا ہے۔ قانون کو ENFORCE کرنے والی اتھارٹی جو ہے عَزِیۡزٌ ہونی چاہیے عَزِیۡزٌ کے معنی ہی ہیں غلبے کا مالک قوت کا مالک۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ کیا معنی ہو گئے؟ قانون کے پیچھے ایک ایسی اتھارٹی جو قانون کو قانون بنا کے رکھ دے وعظ بنا کے نہ رکھے۔ عَزِیۡزٌ ذُو انۡتِقَامٍ (3:4)

لفظ عَذَابٌ کے بعد لفظ انۡتِقَامٍ کے قرآنی مفہوم کے تحت خدا کی ذات کسی سے انتقام نہیں لیتی:

لیجیے! اور لفظ انتقام آ گیا۔ اب ہمارے ہاں وہ عذاب ہی کا ہم رونا رو رہے تھے کہ اب اور بات آ گئی۔ آپ سوچیے تو سہی کہ ہمارے ہاں تو منتقم المزاج جس کو کہتے ہیں تصور کیا ذہن میں آتا ہے؟ ''انتقام لینے والا'' کبھی یہ اچھی صفت نہیں گنی جاتی اور انتقام تو ہوتا ہی ایسے ہے جیسے کسی کو پکڑ کے گھونٹ دیا جائے انتقام لے رہا ہے خدا دیکھیے قرآن میں لکھا ہوا ہے انتقام۔ کیا تصور خدا کے متعلق قائم کیا؟ عزیزانِ من! بنیادی بات سن رکھیے ان چیزوں کو کہیں لکھ رکھیے دین کو سمجھنے کے لیے خدا کے متعلق صحیح تصور آپ کے سامنے آنا چاہیے یہ تصور یہ CONCEPT صحیح ہو جائے سارا دین سمجھ میں آ جاتا ہے۔ صحیح تصور قرآن نے جو دیا ہے۔ یوں سمجھ میں آتی ہے بات! ذُو انۡتِقَامٍ (3:4) چرواہے کو دیکھا ہے کبھی آپ نے اس سڑک کے اوپر لے جانا ہو بھیڑوں بکریوں کو، کوئی بھیڑ بکری ادھر نکل جائے گی ایک اُدھر نکل جائے گی وہ جلدی سے بڑھتا ہے اور پھر اس کو ادھر لاتا ہے اُدھر پھر اس کو لاتا ہے۔ وہ جو ایک راستہ درمیانی ہوتا ہے جس پہ اس نے چلانا ہوتا ہے اس کا کام یہ ہے کہ ان کو ادھر اُدھر لائے آواز دے کے لاتا ہے وہ آواز دے کے نہیں آتی تو پھر لٹھ لے کے بھی اس کے پیچھے جاتا ہے کاہے کے لیے؟ وہ راستے کے درمیان درمیان میں چلیں اِدھر اُدھر نہ ہٹ جائیں۔ انتقام کہتے ہیں کسی کو راستے کے درمیان میں اس طرح سے چلانا کہ ادھر اُدھر نہ چلا جائے۔ کیا بات ہے؟ اس کا غلبہ اس کی قوت وہ اس لیے صرف ہوتی ہے جب درمیان میں راستے پہ چلانا ادھر اُدھر نہ ہٹ جائیں۔ چلانے والا اور قانون دینے والا!

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخۡفٰی عَلَیۡہِ شَیۡءٌ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ۝ (3:5) کوئی شے پستیوں اور بلندیوں میں ایسی نہیں ہے کہ جس کا علم نہ ہو۔ یہ خالی علم ہونا اس چیز کا وہ وہاں رکھی ہے وہ وہاں رکھی ہے اس کے تو کچھ معنی نہیں علم کے اندر تو بڑی وسعتیں ہیں اس میں۔ اور یہاں تو اگلی آیت میں بتا دیا علم کے معنی یہ ہیں وہ جانتا ہے کہ کس شے کو کس چیز کی ضرورت ہے اپنی نشوونما کے لیے وہ جانتا ہے کہ یہ راستے سے اِدھر اُدھر ہٹ جائیں تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ وہ جانتا ہے کہ پرورش کے لیے تربیت کے لیے نشوونما کے لیے ارتقا کے لیے DEVELOPMENT کے لیے' کیا کیا تقاضے ہیں۔ اور اس کے قانون نے ان تقاضوں کو کس طرح سے پورا کرنا ہے۔

رحمِ مادر میں انسان کی پرورش کا سارا سامان قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے:

اور ان تقاضوں کی کیفیت یہ ہے انسانوں کی زندگی میں ھُوَ الَّذِیۡ یُصَوِّرُکُمۡ فِی الۡاَرۡحَامِ کَیۡفَ یَشَآءُ (3:6) تم تو ابھی وجود پذیر ہو کر باہر دنیا میں بھی نہیں آئے تھے کہ اس نے رحمِ مادر کے اندر تمہارے لیے یہ قانون مقرر کر دیا ہوا تھا۔ وہاں جب تمہیں وہ ایک پیکر عطا کر رہا تھا اپنے قانونِ مشیت کے مطابق وہاں بھی اس کا یہ قانون کارفرما تھا اور یہ قانون بھی قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ عزیزانِ من! رحمِ مادر میں بچے کی تشکیل الل ٹپ نہیں ہوتی اس کے لیے بھی اس کے قانون مقرر ہیں۔ جن قوموں نے ان قوانینِ خداوندی کو سمجھ لیا ہے آپ کو معلوم ہے ایک ایک بچہ ان کا صحت' حسن اور شگفتگی کا پیکر بن کے باہر آتا ہے۔ جن قوموں نے کفر برتا ہے ان قوانین سے ان کے بچوں کو دیکھیے صاحب بچے کی پیدائش کے بعد ایک مصیبت آ جاتی ہے صبح شام ٹیں ٹیں روں روں ایک عذاب بچے کا۔ کیا ہے یہ؟ یہ کفر ہے آیات اللہ سے۔ کیا ہے اس کا انجام؟ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ۔ بچے کی پیدائش پہ تو ہم جشن مناتے ہیں ٹھیک ہے خدا کے قانون کے انکار کا نتیجہ عذابِ شدید سارا گھر بھگت رہا ہوتا ہے۔ نسلاً بعد نسلاً یہ چلی آتی ہیں بعض چیزیں قانون کے تابع۔ روکی جا سکتی ہیں قانونِ خداوندی پر ایمان لانے سے۔

رحمِ مادر کے اندر بچے کا ایک EXAMINE کرتے چلے جاتے ہیں اس کو وہاں اس بچے کو اس قسم کی مناسب پرورش مناسب چیزیں دے رہے ہیں اور ابھی یہ علم تو آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ ہے خدا کا قانونِ مشیت وہاں سے شروع ہو جاتا ہے۔ تو کیا جو وہاں سے اس کے تقاضوں کے متعلق یہ سارا سامان کر رہا ہے اس کی پیدائش کے بعد جس نے اَلۡحَیُّ زندگی دی ہے وہ اس کو اَلۡقَیُّوۡمُ بنانے کے لیے اس کو قائم رکھنے کے لیے کوئی قانون نہیں دے گا؟ قانون دیے اس نے' احکام دیے' حقائق دیے' تصورات دیے۔ اب آیا قرآن۔ کہا اس میں دو قسم کے حقائق آپ کو ملیں گے۔ عزیزانِ من! وہ اہم بہت اہم آیت آ رہی ہے۔ جب میں اہم کہتا ہوں تو اس کے یہ معنی نہیں (معاذ اللہ) قرآن کی اور آیت اہم نہیں موضوع کے اعتبار سے وہ خاص IMPORTANCE رکھتی ہے اور اس لیے بھی کہ اس کا غلط مفہوم کہیں سے کہیں لے جاتا ہے۔ بڑی اہم آیت آتی ہے غور سے دیکھیے قرآن سامنے ہے نسخے تو اس کو دیکھیے۔ ھُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ مِنۡہُ اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ

هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ (3:7) یہ الکتاب نازل کی اس میں کچھ قوانین تو ایسے ہیں جو محکمات ہیں یہ وہ ہیں جو اُمُّ الْكِتٰبِ ہیں (میں الفاظ ابھی یہی استعمال کر رہا ہوں) اور دوسرے وہ ہیں جو متشابہات ہیں۔ یہ آپ کے ہاں محکم اور متشابہات کا مسئلہ جو ہے بڑی اہمیت اختیار کیے ہوئے چلا آ رہا ہے۔ اور پھر وہی بات ایک لفظ کے غلط مفہوم نے بات وہاں پہنچا دی ہے کہ اگر اس پہ غور کیا جائے تو کانپ اٹھے لیکن چلا آ رہا ہے اور دھڑلے سے چلا آ رہا ہے دھڑلے سے کہا جا رہا ہے۔ محکمات کہتے ہیں کہ جی وہ آیتیں جن کے معنی محکم ہیں بالکل صاف واضح متعین۔ ٹھیک ہے۔ متشابہات کہتے ہیں جن کے معنوں میں شبہ ہے۔ تفسیروں کے متعلق تو میں عرض کر چکا ہوں نا کہ یہ تو طرحی غزلیں جو لکھی جا رہی ہیں ایک مصرعہ طرح دیا ہوا ہے امام طبری نے چلے آ رہے ہیں اس پہ۔ ہٹ سکتے نہیں کہ اسلاف کے راستے سے ہٹنا سب سے بڑا گناہ ہے چنانچہ آپ کے ہاں جو LATEST آج بھی تفسیر لکھی جا رہی ہے میں اشخاص سے بحث نہیں کیا کرتا بات واضح کرنے کے لیے وہ کہیں مقطع میں سخن گسترانہ بات آ جاتی ہے LATEST تفسیر آپ کے ہاں مودودی صاحب کا تفہیم القرآن ہے۔ میں نے اتفاقاً دیکھا کہ وہاں کیا چیز ہے؟ متشابہات کے متعلق اس میں بھی یہ لکھا ہے وہ آیات جن کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہے۔ قرآن جس کا پہلا لفظ یہ ہے ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ (2:2) جس میں کوئی چیز شک وشبہ والی نہیں ہے۔ کہتے ہیں آیاتِ متشابہات وہ ہیں جن کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہے۔ کیا بات ہوئی صاحب قرآن کی؟ تو گویا اس میں کچھ تو محکمات ہیں ان کے تو مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش نہیں اور پھر باقی جو ہیں ان میں اشتباہ کی گنجائش ہے۔

می نہ سزد خدائے را

کسی پہ الزام نہیں دیتا خود ان کے متعلق اگر یہ کہا جاتا ہے نا کہ فلاں جو آپ کے ہاں آپ نے لکھا ہے وہ مفہوم واضح نہیں اس میں تو کچھ اشتباہ کی گنجائش ہے لٹھ لے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہتے ہیں ہماری کتاب میں؟ یہ ایسا ہوگا تو خدا کی کتاب میں ہوگا ہماری کتاب میں ایسا کہتے ہو۔ ٹھیک ہے جی ''وہ کی جو روسب کی بھابھی'' جس کا جی میں آئے کہہ لے اس کے متعلق۔ کوئی یہ کہنے والا نہیں کہ کتنا ANTI ISLAMIC ہے یہ تصور کہ اس کی کتاب میں ایسی آیات ہیں جس کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہے۔ عزیزانِ من! بات بڑی صاف تھی۔ بار بار پھر وہ یاد آ جاتا ہے

میرے ساقی نے عطا کی ہے مے بے گرد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

یہ تو ان کے پیمانوں کے رنگ ہے جن سے اس بے گرد و صاف مے ازل کو رنگین بنا کے پیش کر دیا جاتا ہے۔ محکمات ٹھیک ہے محکم اصولی چیزیں بنیادی چیز اس نے کہہ دیا ام الکتاب اصل و بنیاد احکام قوانین۔ لیکن قرآنِ کریم میں احکام و قوانین ہی تو نہیں ہیں انہیں سمجھانے کے لیے کہیں امِ سابقہ کی تاریخی داستانیں بھی ہیں وہ بھی چھوڑ دیجیے' بہت سے ABSTRACT TRUTHS ہیں مجرد حقائق ہیں۔ خود خدا کا تصور کوئی محسوس شے نہیں ہے حیاتِ آخرت کوئی محسوس

شے نہیں ہے خود انسان کی ذات محسوس شے نہیں ہے جسے آپ روح کہتے ہیں یا نفس کہتے ہیں محسوس نہیں ہے خود یہ صداقتیں جو قرآنِ کریم نے دی ہوئی ہیں اصولی طور پہ بھی وہ محسوس نہیں ہیں۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں ان مجرد حقائق کو سمجھانے کا طریق:

اور یہ پھر سمجھ لیجیے جن کو ABSTRACT TRUTHS کہتے ہیں مجرد یا بسیط حقائق کہتے ہیں حقیقت تو وہ ہو لیکن ٹھوس طور پہ محسوس طور پہ اس طرح سے تمہارے سامنے نہ آئے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے خود خدا سب سے بین مثال ہے ایک حقیقت ہے اور میں کہتا ہوں ایک حقیقت نہیں THE TRUTH ہے THE REALITY ہے محسوس نہیں ہے اسے ABSTRACT کہتے ہیں۔ اب غیر محسوس حقائق ہوں انہیں سمجھانا ہو لوگوں کو کیسے سمجھایا جائے؟ انہیں ہمیشہ تشبیہاً سمجھایا جاتا ہے متشابہات کے معنی ہیں وہ جنہیں تشبیہاً سمجھایا گیا ہے۔ استعارہ لایا جاتا ہے تشبیہات لائی جاتی ہیں اس کے لیے مثالیں پیش کی جاتی ہیں SYMBOLICALLY سمجھایا جاتا ہے۔ ایک تو وہ ہوتا ہے جس کے معنی LITERALLY لیتے ہیں لفظ ہے وہی اس کے معنی ہیں ایک ہوتا ہے کہ لفظ تو وہ بہرحال ہماری ہی زبان کا ہوگا لیکن اسے استعمال کیا ہوگا تشبیہ کے طور پر استعارتاً تمثیلاً۔ قرآن میں جنت کا جہاں ذکر آتا ہے مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ (13:35) کہ اس جنت کی مثال یوں سمجھو اس لیے کہ مرنے کے بعد کی زندگی تو ہماری موجودہ سطح کے اوپر ایک مجرد حقیقت ہے لیکن اسے سمجھانے کے لیے تو ہمارے ہی الفاظ استعمال ہوں گے۔ بہترین آسائش کی چیزیں' باغات' سایے' لحمِ طیور' بہتی ہوئی ندیاں' ان کے کنارے لبِ جوسبزہ پھول یہ سب ہماری زبان کے الفاظ ہیں لیکن کہہ دیا کہ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ (13:35) یہ مثالیں دے کے ہم نے سمجھایا ہے کیونکہ آگے کہہ دیا کہ کوئی شخص یہ نہیں جان سکتا کہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان ہم نے وہاں رکھا ہے وہ ہے کیسا؟ لیکن مثال کے طور پہ تو سمجھانا پڑتا ہے نا جی۔ یہ دقت تو یہاں پیش آتی ہے ہر ایک کو' پیش آئی اتنے بڑے شاعر کو آپ کے ہاں غالب کو کہ جو EXPRESSION کا بادشاہ تھا اپنے دور کا وہ بھی چلا اٹھا کہ

ہر چند مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

وہ کہتا ہے کہ یہ ''بادہ وساغر'' استعارے ہیں' بات مشاہدۂ حق۔ آپ دیکھ رہے ہیں یہاں اس نے کیا لفظ استعمال کیا ہے REALITY یہ ABSTRACT ہے بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر' تشبیہات۔ مثال کے طور پہ یہیں لیجیے قرآنِ کریم نے ایک جگہ کہا ہے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ (4:23) تم پر تمہاری مائیں حرام قرار دیں نکاح کے لیے۔ اب یہاں واضح ہے کہ ام کے معنی وہ ماں ہے جو بچے کو جنتی ہے دوسرے معنی ہی نہیں ہیں بالکل صاف واضح اس لیے کہ قانون کی بات ہو رہی ہے زندگی کا ایک LAW دیا جا رہا ہے وہاں ام کے معنی تشبیہی نہیں ہیں وہاں حقیقی معنی ہیں۔ اسے حقیقی معنی کہتے ہیں عربی زبان میں دوسرے معنی ایک مجازی ہوتے ہیں۔ اُمُّ الْكِتٰبِ (3:7) وہی لفظ ام یہاں آیا ہے وہ ام الکتاب ہیں

اب یہاں LITERARY معنی تو آپ اس کے لے نہیں سکتے کتاب کی ماں کتاب کے اندر تو وہ آیتیں ہیں وہ کتاب کی ماں کیسے ہوئے؟ نظر آیا کہ یہاں ام کا لفظ جو ہے اصل و بنیاد کے اعتبار سے معنی میں استعمال کیا گیا ہے تشبیہاً۔ اسے مجازی معنی کہتے ہیں ہر زبان میں یہ ہوتا ہے LITERARY MEANING, METAPHORICIAL MEANING۔ اُمُّ الْکِتٰبِ محکمات اس لیے کہ قانون کو ہونا ہی ایسا چاہیے کہ متعین لفظی معنی اس کے وہی ہوں ورنہ اگر تم پہ مائیں حرام قرار دی گئی ہیں آپ لے لیں استعارتاً تشبیہاً تو چلیے کسی کورٹ میں اور وہاں جا کے شاعری کیجیے پھر دیکھیے اس کا کیا نتیجہ ہوتا ہے؟ وہاں شاعری نہیں چلتی یا تشبیہات استعارات کی بات نہیں ہے۔ محکمات ہے۔ ایک ہی مثال سے میں سمجھتا ہوں آپ سمجھ گئے ہوں گے اس کے معنی کیا ہیں۔

ہمارے ہاں کی پیش کردہ تفسیروں میں عرش کی وضاحت اور اس کا استعمال:

قرآنِ کریم میں یہ جو ABSTRACT حقیقتیں ہیں مجرد حقیقتیں نامحسوس غیر مرئی, INVISIBLE INPERCEPTABLE جن کا آج تصور بھی حقیقت میں نہیں ہم کر سکتے۔ الفاظ ہمارے ہیں خدا نے کائنات کو پیدا کیا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (7:54) پھر وہ عرش پہ مستوی ہو گیا۔ استوٰی کے معنی ہوتا ہے غالب آ جانا جم کے بیٹھ جانا کسی جگہ ESTABLISH کر لینا اپنے آپ کو۔ عرش: عرش تو تخت پوش کو کہتے ہیں تختے کو کہتے ہیں تختِ حکومت کو کہتے ہیں وہ جو لکڑی کا بنا ہوا خواہ وہ تختِ طاؤس کیوں نہ ہو کروڑوں روپے کا بنا ہوا کوئی بھی ہوگا اس کو عرش کہا جائے گا۔ پھر وہ عرش پہ بیٹھ گیا۔ اب ظاہر ہے کہ جب خدا کا تصور یہ ہے کہ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (57:4) تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے وہ تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہے تو کوئی لکڑی کا یا اس قسم کا تخت تو نہیں ہوگا خواہ وہ تختِ طاؤس ہی کیوں نہ ہو کہ وہ کسی مقام میں رکھا ہے اور اس کے اوپر خدا بیٹھا ہے۔ یہ تو معنی ہو نہیں سکتے۔ سیدھی سی بات ہے تختِ حکومت کہتے ہیں، جب آپ THRONE کہتے ہیں تو آج بھی انگریزی میں اس سے مطلب آپ کا سچ مچ کا وہ تخت نہیں ہوتا جو کسی زمانے میں ہوتا تھا۔ اس کا مطلب ''اقتدار'' ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ CROWN تاج کہتے ہیں۔ اب وہ سچ مچ کا تاج کہیں کہیں رہ گیا ہے وہ بھی فضا میں اٹھتا چلا جا رہا ہے غیر فطری چیز تھی نا۔ اس کا مفہوم آپ سمجھتے ہیں نا جب آپ کہتے ہیں تختہ الٹ کے رکھ دیا تو یہ نہیں ہوتا کہ اس کی دوکان کے سامنے ایک تخت پوش پڑا تھا ''اوہنوں ایووں کر دتا'' آپ سمجھتے ہیں ان کے معنی کیا ہیں؟ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (7:54) کائنات کو اس نے تخلیق کیا اور اس کا مرکزی کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھ لیا بات صاف ہو گئی۔ لیکن ہمارے ہاں چلے صاحب! آپ کو شاید علم نہیں کہ اس عرش کی پیمائشیں بھی ہمارے ہاں دی گئی ہوئی ہیں۔ آگے چلے قرآن نے کہہ دیا وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ (11:7) اس کا عرش پانیوں پر ہے۔ ماء کے معنی بھی پانی اور عرش تو پھر وہ تھا ہی تختہ۔ وہ تو غنیمت ہے لکڑی کا تھا۔ عرش پانیوں پر ہے اب پانی تو یہاں ہوتا ہے کیا کیا جائے صاحب؟ اس کے بعد یہ تفسیر اور جیسا میں نے عرض کیا کہ ہماری بدبختی اور بدقسمتی ہے اس امت کی کہ ان لوگوں نے اپنے ذہن سے جو مفہوم متعین کیا اور اس

میں میں نے کہا ہے اور بار بار کہتا ہوں لکھا ہے میں نے کئی دفعہ میں ان کو ACCUSE نہیں کرتا معاذ اللہ کہ کوئی چیزیں بد نیتی سے کیں اس دور کی علمی سطح ہی اتنی تھی انسان کی ذہنی سطح ہی اتنی تھی جنہوں نے یہ کچھ لکھا ہے ہم اس دور میں لکھتے تو شاید یہی کچھ ہم لکھتے یہ کچھ ہماری کاری گری نہیں ہے کہ ہم اتنا آگے بڑھ گئے علمِ انسانی اتنا آگے بڑھ گیا اس کی بنا پہ ہم ان سے بہتر سوچ سکتے ہیں۔ وہ اب جب یہ ہوا کہ اس کا عرش پانیوں پر ہے تو اب پانی کیا کیا جائے یہاں تو سارے پانی دیکھ لیے یہاں تو کوئی عرش تیرتا نہیں تھا۔

ہماری اس بدقسمتی کی بنیادی وجہ:

میں نے کہا ہے ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ تفسیریں انہوں نے اپنے ذہن سے لکھیں منسوب کر دیا اسے نبی اکرم ﷺ سے۔ یہاں آ کے ہماری ساری چیز ہوگئی اب جتنے بھی غیر مسلم ہیں ان چیزوں کو وہ لیتے ہیں تو اس کے بعد کہتے ہیں کہ یہ تمہارے رسول ﷺ یہ تھا قرآن جو وہ سمجھاتے تھے؟ اور اس کے بعد غیر تو خیر پہلے کہتے تھے اب تو ہماری اگلی نسل خود کہنے لگ گئی ہے ان کا بھی دوش نہیں ہے بے چاروں کا۔ سنیے تو کیا تفسیر دی گئی ہے یہ تفسیر روایت کی یعنی حدیث کی جسے آپ کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس زمین سے پہلے آسمان کا راستہ پانچ سو میل کا پھر ایک آسمان سے دوسرے کا وہ تو آپ کو میں بتا چکا ہوں نا کہ ان کے نزدیک یہ آسمان ایک دو تین چار اس طرح سے ہیں ایک دوسرے کے اوپر۔ پانچ سو میل کا پھر اس کے بعد پانچ سو میل کا پھر ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے (پانی لانا ہے نا) اس سمندر میں اب اگر تیرتا ہوا تخت رکھا جائے تو وہ تو پتہ نہیں ڈگمگا جائے کہیں ہو جائے' استوٰی ہے جم کے بیٹھ گیا تو جما کے کیسے بٹھایا جائے؟ اس سمندر میں آٹھ پہاڑی بکرے ہیں۔ عزیزانِ من! سنیے یہ اس کو منسوب کیا جاتا ہے رسول اللہ ﷺ کی طرف یہ کہہ کے کہ یہ حدیث ہے۔ آٹھ پہاڑی بکرے ہیں اتنے بڑے بڑے کہ وہ سمندر جو ہیں اس کی گہرائی پانچ سو میل کے سفر کے مطابق ہے لیکن وہ بکرے اتنے بڑے ہیں کہ ان کے گھٹنوں تک وہ پانی آتا ہے اور ان بکروں کے سینگ پر خدا کا تخت ہے اس پہ خدا بیٹھا ہے۔ عزیزانِ من! غور کیجیے میں نے کہا یہاں تک خیر تھی کسی امام طبری نے کسی ابنِ کثیر نے یہ چیز لکھی ہم کہہ سکتے تھے کہ نہیں صاحب! انہوں نے اپنے دور میں علمی سطح کم تھی یہی سمجھے ٹھپ کر کے رکھ دیجیے کوئی الزام نہیں کوئی حجت نہیں ہمارے لیے۔ جب وہ یہ کہہ دیں کہ حضورِ نبی اکرم ﷺ نے یہ بیان فرمایا پھر اس سے انکار کے بعد آپ تو جانتے ہیں جو میرا حشر ہو رہا ہے وہ آپ کو بھی معلوم ہے۔

متشابہات وتشبیہات کے تحت قرآنی آیات پر غور وفکر کرنے کی دعوت:

متشابہات تشبیہاً بات بیان کی۔ تمام کائنات پہ کنٹرول ہے۔ یہاں کہا تھا الحی زندگی دینے والا۔ اور سب سے بڑا کنٹرول جو ہے زندگی جو ہے اس کے اوپر کنٹرول جو ہے یہ ہونا چاہیے الحی سے تو بات شروع ہوئی تھی۔ یہاں کہا نا کہ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ (11:7) ماء پر بھی اس کا کنٹرول۔ اور دوسری جگہ کہا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (21:30) اور زندہ شے جو ہے اس کو ہم نے پانی سے زندگی عطا کی پانی پہ خدا کا کنٹرول ہوا اس لیے وہ الحی ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ

شَیۡءٍ حَیٍّ (21:30) کتنی عظیم حقیقت چودہ سو سال پیشتر بتائی جاتی ہے۔ جہاں یہ جاتے ہیں نئے PLANETS پہ بھی وہاں دیکھنا ہوتا ہے زندگی ہے یا نہیں وہاں دیکھتے یہ ہیں کہ نمی ہے یا نہیں؟ جب اس مشتِ خاکم میں جو وہاں سے چاند سے لائے ہیں انہوں نے کہا کہ وہ ہمیں کچھ نم آلود نظر آئی تو یہاں کے سائنٹسٹ جو تھے بائیالوجسٹ نے کہا کہ امید بندھ گئی ہے کہ چاند میں زندگی ہے اس لیے کہ اس کی راکھ میں پانی کی نمی کے آثار نظر آتے ہیں۔ چودہ سو سال پہلے قرآن کہتا ہے وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ (21:30) زندگی کی نمود پانی سے ہوتی ہے۔ زندگی کے نمود پانی سے پانی کے اوپر کنٹرول خدا کا' خدا کا عرش۔ تو جو اصلِ حیات ہے جس کے بغیر زندگی نہیں ہوسکتی INORGANIC MATTER کے اندر اس پہ بھی کنٹرول اسی کے قانون کا ہے۔ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ (7:54) یوں وہ ساری کائنات کے مرکزی کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں لے کے بیٹھا ہوا ہے۔ عزیزانِ من! متشابہات' تشبیہاً باتیں کی کرنی ہوتی تھیں تشبیہاً باتیں لیکن یہ متشابہات جو ہیں کس طرح سے یہ محکمات بنیں گی؟ آپ دیکھ رہے ہیں متشابہات محکمات کی صف میں آتی چلی جارہی ہیں جب وہ تشبیہ جو ہے وہ بات سمجھ میں آجائے تو معنی متعین ہوجاتے ہیں۔ یہی چیزیں وَکُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ (36:40) وہ اجرامِ فلکی جو ہیں ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے فلک کے اندر یَّسۡبَحُوۡنَ تیر رہا ہے انہوں نے یہ چیز کہی ان ستاروں کے متعلق تو انہوں نے کہا کہ نیچے کے آسمان کے اندر یہ جڑے ہوئے ہیں ہیروں کی طرح تو یَّسۡبَحُوۡنَ تو پھر آگے بات حرکت کی تو نہیں رہی اس کے معنی کیے کہ وہ خدا کی تسبیح کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے وہ وہیں تک پہنچ سکتے تھے ہمارے دور میں علم الافلاک اتنا آگے چلا گیا ہے ہمیں معلوم ہے۔ اب یہ جو لفظ ہے قرآنِ کریم کا عربی زبان میں لیجیے اس کے معنی ہیں ہر کرۂ آسمانی اپنے اپنے مدار میں تیرتا پھر رہا ہے۔ بات متعین ہوگئی۔

تشبیہات کا محکمات کی طرف سفر کا آغاز:

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ متعین کس طرح سے ہوتی ہیں؟ یہ تشبیہات سے بات بیان کی ہوئی محکم بنتی ہے الحق بنتی ہے سَنُرِیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمۡ اَنَّہُ الۡحَقُّ (41:53) ہم تمہیں اپنی نشانیاں تمہارے عالمِ انفس میں انسانوں کی اپنی دنیا میں تمہاری اپنی زندگی میں اور عالمِ آفاق میں خارجی کائنات میں دکھاتے چلے جائیں گے اپنی نشانیاں تاآنکہ یہ بات واضح ہوجائے کہ قرآن کا ایک ایک لفظ حق ہے۔ عزیزانِ من! آیاتِ متشابہات محکمات میں یوں داخل ہونگی جس وقت بھی اس کائنات کے پردوں کے اندر کوئی چھپی ہوئی حقیقت انسان کے متجسس متلاشی ہاتھ سے ذرا سا بھی اس کا پردہ اٹھے گا جسے DISCOVER کرنا کہتے ہیں یوں پردہ اٹھے گا عروسِ حقیقت مسکراتی ہوئی سامنے آئے گی قرآن کی ایک متشابہ آیت محکم بن جائے گی۔ عزیزانِ من! بنتی چلی جارہی ہیں بنتی چلی جائیں گی اس طرح سے یہ چیزیں حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمۡ اَنَّہُ الۡحَقُّ (41:53) تاآنکہ یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ یہ حق ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض حقیقتیں جن کا تعلق اس زندگی اس کائنات سے ماورا ہے METAPHYSICS ہے وہ اس طرح محسوس شکل میں تو سامنے نہیں

آئیں گی لیکن انسانی علم اس طرح سے آگے بڑھتا ہوا چلا جا رہا ہے کہ غیر مرئی حقیقتیں بھی جو ہیں ان کے متعلق بھی بڑی وضاحت سے بات سمجھ میں آتی چلی جا رہی ہے۔ جس PSYCHE کے متعلق ہم پچاس برس پیشتر کچھ نہیں جانتے تھے جسے انسانی سائیکولوجی کا علم جسے کہتے ہیں انسانی ذات یا مائنڈ کہتے ہیں آج سائیکولوجی نے اس کے متعلق بھی کتنے پردے اٹھا دیے ہیں۔ اور ابھی تو علمِ انسانی اپنے بچپن میں ہے ابھی تو گھٹنوں چلنے لگا ہے اسے آگے بڑھنے دیجیے یہ جتنے میٹافزکس کے بھی حقائق ہیں محسوس شکل میں تو سامنے نہیں آئیں گے لیکن علمِ انسانی اتنا آگے بڑھے گا ذہنِ انسانی اتنا DEVELOP ہوگا کہ وہ جو تشبیہات ہیں ان کے بڑے نکھرے ہوئے مفہوم سامنے آتے چلے جائیں گے متشابہات جو ہیں وہ یوں محکمات بنتی چلی جائیں گی۔

دلوں کی نفسیاتی بیماری انسان کو صحیح راستے پر راغب ہونے ہی نہیں دیتی:

قرآن کہتا ہے فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَہَ مِنۡہُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَۃِ وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِہٖ (3:7) کچھ لوگ وہ ہیں کہ جو بالکل صحیح راستے کے اوپر سیدھے سیدھے کے اوپر چلے جانا چاہتے ہیں کچھ وہ ہیں کہ جن کے دلوں میں کچھ ٹیڑھ ہوتی ہے سیدھی بات کو بھی ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں وہ کہتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں؟ ان کی کیفیت یہ ہے کہ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَہَ مِنۡہُ جن باتوں سے تشبیہ دی تھی اس نے ان کو انہی کو اصل سمجھ کر ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے خدا کے عرش کی پیائش' حوضِ کوثر کے آب خوروں کی تعداد۔ خدا نے کہا ہے کہ تم ہماری آنکھوں کے سامنے یہ کرو' خدا کی آنکھوں کے متعلق تفصیل۔ اس نے کہا ہے ہمارا ہاتھ تمہارے ہاتھ پہ تھا' خدا کے ہاتھ کی تفصیل۔ یعنی یہ چیزیں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آنکھ ہاتھ جب وہ کہتا ہے سمیع سننے والا جب وہ کہتا بصیر تو انہوں نے اس کے کان اس کی آنکھیں اس کے ہاتھ وہ سارا کچھ جو ہے یہی ہوسکتا تھا کہ وہ ہمارا اتنا سا لمبا ہے خدا کا ہاتھ پچاس گز کا بنایا انہوں نے' ہمارے کان اتنے اتنے ہیں اس کے کان بہت بڑے بڑے بنا دیے کیا ہوا؟ مَا تَشَابَہَ مِنۡہُ جن چیزوں سے اس نے تشبیہ دی تھی یہ ان کے پیچھے چل پڑے۔ اب اس سے فتنہ پیدا ہوا یہ جو ٹکراؤ آپ کے ہاں قدیم وجدید کا اس دور میں ہو رہا ہے نا یہ فتنہ آپ کو پتہ ہے یہ کیوں ہو رہا ہے؟ مَا تَشَابَہَ مِنۡہُ کے پیچھے چلے تھے یہ یہ چیزیں انہوں نے اپنے ہاں لکھ لیں متعین کر کے اب جو بھی ان سے ہٹ کے کوئی چیز ان تشبیہات کو تشبیہی انداز میں سمجھ کے ان کے متعلق ایک تصور کوئی اور دیتا ہے اس کا نام ANTI ISLAMIC ہو جاتا ہے دوڑ یو پکڑ یو ماریو۔ کیا ہوا ہے؟ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَہَ مِنۡہُ دلیل؟ اسلاف کہتے چلے آ رہے ہیں اسلاف سے آگے وہی دلیل کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں آیا ہے بس وہاں آ کے تو معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ عزیزانِ من ! یہ ٹھیک ہے کہ اس قسم کے ہنگاموں سے آپ زبانیں روک سکیں گے دلوں کے اندر پیدا ہونے والے شبہات کو آپ نہیں روک سکتے۔ اور جب دلوں کے اندر یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں اور زبانیں بند کر دی جاتی ہیں ؎

پری رو تابِ مستوری نہ دارند
چو در بندی ز روزن سر برارند

اگر آپ ان ابھرنے والے شکوک پر دروازے بند کر دیں گے تو وہ روشن دانوں سے نکل کے باہر آ جائیں گے آپ اگر یہ کچھ کریں گے دلوں کے اندر پیدا ہونے والے شکوک کا علاج یہ نہیں ہے کہ آپ لاحول کی ایک دھمکی سے ڈرا دیں اس کو تو تسکین کا سامان پیدا کرنا ہوگا صحیح طریقے سے آپ نہ نکلنے دیں گے PERVERTION کے ذریعے سے پھر وہ سرکشی بنے گی طوفان بنے گا سیلاب بنے گا۔ اور جب سیلاب بنے گا تو قرآن کہتا ہے کہ اس فتنے سے ڈرو کہ جو پھر اپنے بہاؤ میں صرف ظالمین کو ہی لے کے نہیں جایا کرتا (8:25)۔

نہ کہ درا منزلت باشد نہ مہ درا

اس کے اندر پھر سب بہا کرتے ہیں۔ کیا ہو رہا ہے؟ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَأْوِيلِهٖ (3:7) جو چیز تشبیہاً بیان کی تھی اس کے متعلق یہ چلتے ہیں کہ یہ اصل ہے یہ حقیقت ہے خود اس کی یہ تاویل کرتے ہیں۔ آ گیا ایک اور لفظ تاویل۔ عزیزانِ من! وقت بڑی تیزی سے جا رہا ہے بات بڑی اہم آ رہی ہے۔ تاویل: آپ کے ہاں معلوم ہے نا تاویل کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ ''او عجیب جئی تاویل کر دتی او ہنے جی او تھے مجمع اچ'' وہ تاویل کر دی ہمیشہ برے معنوں میں یہ آتا ہے یعنی ایسی بات لے لینا اس کے معنی کہ وہ جو اس کے اندر ہو ہی نا تاویل اس کی کی جاتی ہے۔ تاویل کے معنی ہوتا ہے اس کے مادے کے معنی ہوتے ہیں انجامِ کار۔ تاویل الاحادیث جو ہے کہ حضرت یوسفؑ کے متعلق ہے کہ انہیں علم دیا گیا تھا اس میں یہ چیز ہے کہ انہیں ہم نے ایسی بصیرت عطا کی ایسی فراست انہیں ملی تھی کہ جو چیز آج ابھی سامنے یوں آ رہی ہے اور بہت دور جا کے اس کا نتیجہ نکلنا ہے وہ آج کے ان واقعات پہ غور کر کے اس کے انجام کے متعلق اندازہ لگا لیتے تھے کہ یہ چیز ہوگی اس طرح سے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں کہ مومن کی نگاہ پھر یہ ہو جاتی ہے کہ

خارِ دید و احوالِ چمن گفت

کانٹا دیکھتا ہے تو پورے باغ کی کیفیت بیان کر دیتا ہے۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

اسے تاویل کہتے ہیں م آلِ کار انجامِ کار آخر الامر آ کے جہاں کسی چیز نے ٹھہرنا ہوتا ہے ''آ تاویل نئیں جیہڑ یاں روز کہندے او تاویلاں کر دا پھر دا ہیگا اے''۔ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ (3:7) جن کو تشبیہات کے ذریعے بیان کیا ہے ULTIMATELY اس کا مفہوم کیا ہے یہ ہیں اس کے معنی۔ وہ کیا ہے؟ پہلی چیز تو یہ ہے کہ خدا ہی جانتا ہے جس نے یہ چیزیں دی ہیں وہ جانتا۔ اب اس کے بعد آگے چلیے قرآنِ کریم میں ہمارے ہاں یہ کہا گیا کہ یہاں ہے فل سٹاپ اس کے متعلق تو صرف خدا ہی جانتا ہے صاحب' ہو گئے دروازے بند۔ آگے ہے وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا (3:7) اور وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ علم میں محکم لوگ جو ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لائے ان چیزوں کے

اوپر صاحب خدا نے جو کہا ہے ٹھیک ہی کہا ہوگا۔

راسخ عقیدہ حضرات کی بجائے کسی معاملہ کی تہہ تک پہنچنا صاحبانِ اولی الالباب کے لئے زیادہ مشکل نہ رہے گا:

سوال یہ ہے کہ یہ بات تو عوام کہہ سکتے تھے کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہماری سمجھ میں بات تو نہیں آئی لیکن ہمارا ایمان یہ ہے کہ جو خدا نے کہا ہے ٹھیک ہے یہ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ جو ہیں ان کا بھی یہی مسلک ہوگا کیا؟ تو یہ جو قرآن نے بار بار زور دیا ہے اس چیز پہ کہ عقل وفکر سے کام لو اور یہ تو قرآن ہے کہیں دور جا کے زور نہیں دیا یہ آیت نہیں ختم ہوئی اگلے لفظ ہیں وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (3:7) صحیح حقیقت سامنے ان کے آئے گی جو الباب ہیں جو صاحبانِ عقل وبصیرت ہیں۔ صاحبانِ عقل وبصیرت کا تو یہ مقام ہے اس لیے آیت یہ ہے وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ (3:7) بنیادی طور پر جس خدا نے ان چیزوں کو تشبیہاً بیان کیا ہے وہ جانتا ہے کہ انجامِ کار (ULTIMATELY) ان کا مفہوم کیا ہے؟ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ (3:7) اور وہ لوگ جو علم میں راسخ ہوتے چلے جاتے ہیں ''ایویں لے پچ نئیں ہوندے'' عجیب چیز ہے یہ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ (3:7) نہایت محکمیت سے TRUTH کے پیچھے چلنے والے حقائق کے متلاشی ان چیزوں پہ پہنچنے والے۔ راسخ صرف متلاشی نہیں ہوتا کسی چیز پہ پہنچ کے اس پہ جم کے کھڑے ہو جانے والا ہوتا ہے۔

ان چیزوں کی تاویل جو ہے حقیقی تاویل جو ہے بنیادی طور پہ خدا کے ہاں' علمِ انسانی جتنا بڑھتا چلا جائے گا اس کی نسبت سے جتنے لوگ بھی اس علم کے اندر اپنے آپ کو محکم کرتے چلے جائیں گے وہ بھی ان کی تاویل کے متعلق معلوم کرتے چلے جائیں گے کہ اس کا مفہوم کیا ہے؟ لیکن یہ تو کسی ایک دور کی بات نہیں ہے نہ ہی کسی فرد کی زندگی میں ایک ہی دفعہ یہ چیز ہو سکتی ہے یہ تو بتدریج سامنے آئے گی ۔ وہی آیت جو میں نے ابھی تلاوت کی سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ (41:53) دکھاتے چلے جائیں گے ہم یہ چیزیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دور میں ابھی کچھ چیزیں ابھی ایسی ہوں کہ جو متشابہات کے ضمن میں محکمات کی صف میں نہ آئی ہوں وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ یہ جانتے ہیں لیکن ان کا مسلک یہ ہوتا ہے یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا (3:7) وہ کہتے یہ ہیں کہ جو کچھ بھی اس قرآن میں کہا گیا ہے وہ سب کا سب ہمارے خدا کی طرف سے ہے ہم اس کی سچائی پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس ایمان کے بعد اس تلاش میں پھر وہ نکلتے ہیں کہ یہ جو تشبیہات ہیں ان کے پیچھے جو حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں ان پہ سے پردہ اٹھایا جائے۔ اور جب وہ جس حد تک انسان کا علم جا سکتا ہے وہاں تک جا کے وہ اس حقیقت سے پردہ اٹھا کے اس کو محکمات میں لے آتے ہیں تو یہی جو ان کا ایمان ہے یقین میں بدلتا چلا جاتا ہے۔ لیکن یہاں تک پہنچے ہوں یا نہ پہنچے ہوں ایمان ان کا یہی ہوتا ہے کہ قرآن میں ہر حقیقت جو بیان کی گئی ہے وہ حقیقت ہے REALITY ہے TRUTH ہے پھر اس کے بعد اس REALITY کے اوپر پڑے ہوئے پردے کو

DISCOVER کرنے کے لیے آگے جاتے ہیں۔

قرآنِ حکیم نے تو اپنے ایک لفظ پر غور و فکر کی دعوت دے رکھی ہے:

وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (3:7) جو صاحبانِ عقل و بصیرت ہیں یہ وہ کام کر سکتے ہیں۔ تو اگر اربابِ بصیرت جو ہیں صاحبانِ عقل و بصیرت جو ہیں ان کا بھی یہی مسلک کہ نہیں صاحب! قرآن میں جو کچھ لکھا ہے اس پہ تو آنکھیں بند کر کے ایمان لانا چاہیے وہ جو پہلا مفہوم ہے يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (2:3) کا ہمارے ہاں اس کے معنی ہی یہ لیے جاتے ہیں کہ کوئی چیز تحقیق تصدیق وغیرہ تفتیش اور علم کی رو سے نہیں ہے آنکھیں بند کیے ہوئے ایمان لے آنا ہے۔ تو یہ الباب کا ہے کے لیے صاحبانِ عقل و بصیرت کا ہے کے لیے؟ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (3:7) لیکن طریقہ اس کا کیا ہوگا یہ ہے اہم چیز۔ طریقہ اس کا یہ ہے کہ قرآن کے اندر محکمات آیت متعین مفہوم والی واضح طور پر' جو کچھ باقی کہا گیا ہے اس کا کوئی مفہوم ایسا نہیں صحیح ہو سکتا جو محکمات کے خلاف جائے اس لیے کہ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ میرے اندر کسی قسم کا اختلاف اور تضاد نہیں ہے۔ لہٰذا متشابہ آیت وہی محکم کا درجہ حاصل کرے گی جس کا مفہوم اس کے محکمات کے خلاف نہ جا رہا ہو۔ خلاف جا رہا ہے تو ہمیں رکنا ہوگا کہ ابھی ہماری تحقیق حقیقت تک نہیں پہنچ سکی ہمیں مزید کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے لیے راہنمائی کہاں سے ملے گی آپ کو؟ یہ دیکھیے آیت رَبَّنَا یہ لوگ ہیں اولی الالباب نکلتے ہیں حقیقت کی تلاش میں علم کی وادیوں میں آرزوئیں دل میں یہ مچلتی ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا (3:8) جب تو نے ہمیں قرآن کے ذریعے سے صحیح راستہ جو ہے وہ دکھا دیا ہے تو پھر ایسا نہ کہیں ہو جائے کہ اس کے بعد ہمارے دلوں میں کسی قسم کی کج روئی پیدا ہو جائے۔ تُزِغْ یا زیغ جو ہے اس کے معنی ہوتے ہیں صحیح راستے سے اِدھر اُدھر ہٹ جانا۔ ایسا نہ ہو جائے ہمارے ہاں کہ چلے تو ہیں ہم ایک مجرد حقیقت کو ABSTRACT TRUTH کو ایک ایسی شکل میں دیکھنے کے لیے چلے تو ہیں جو محسوس نہیں تو کم از کم محسوس طور پہ سمجھ میں آ جائے اور اس کا نتیجہ کہیں یہ نہ ہو کہ ہم اصلِ حقیقت سے ہٹ کے کسی اور ہی طرف چل نکلیں۔ آگے قرآن نے اس کا طریقہ بتایا ہے کہ قلوب میں کج روی پیدا نہ ہو۔

لفظ وہاب کا لغوی مفہوم اور پھر وہبی طور پر سامانِ نشوونما کا عطا کرنا رحمت ہے:

برادرانِ عزیز! وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً (3:8) اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو وحی کو رحمت کہا ہے اس لیے کہ انسانیت کی صحیح نشوونما جو ہے وہ اسی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ اپنے آپ کو وہاب کہا ہے وہاب کے معنی ہوتا ہے بغیر کسی معاوضے اور صلے کے کوئی چیز عطا کر دینے والا۔ وحی کسی معاوضے اور صلے سے نہیں ملتی مزدبھی نہیں ہے انسانی محنت کا ماحصل بھی نہیں ہے فکرِ انسانی کی تخلیق بھی نہیں ہے وہبی طور پر خدا کی طرف سے ملی ہے اس نے یہ عطا کیا ہے اس رحمت کو سامانِ نشوونما کو وہبی طور پر اپنی طرف سے۔ اس لیے کہا کہ یہ جو ہے کہ ہمارے قلوب میں کسی قسم کی کج روی پیدا نہ ہو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر

دوراہے پہ جہاں ہم کھڑے ہوں ایسا کر کہ تیری طرف سے یہ جو ہدایت ملی ہے وہ ابھر کر ہمارے سامنے آ جائے۔

وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ دیکھیے الفاظ! ہم اپنی فکر کے پیچھے چلے ہوئے جا رہے ہیں لیکن جہاں زندگی کا دوراہا آئے گا وہاں ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ کس طرف کو مڑا جائے؟ ہوسکتا ہے کہ ہم اپنی فکرِ خام کی رو سے یا وہ DATA جو ابھی مکمل نہیں ہوا ہمارے پاس جتنی انفرمیشن ہمارے پاس آئی ہے اس کی رو سے ہم یقینی طور پہ سمجھ لیں کہ ادھر جانا چاہیے ہمیں اور اُدھر جا نکلیں اور اُدھر جا نکلنے سے کیا ہوگا؟

عزیزانِ من! میں یہ بھی سمجھا دوں اِدھر اُدھر جا نکلنے سے انسان کی محنت' وقت اور توانائی جو ہے وہ زیادہ صرف ہوتی ہے۔ یہ اِدھر اُدھر نکلنے والے راستے جو ہیں TRIAL & ERROR کی رو سے فکر اور علمِ انسانی اس کی محنت یہ اسے صراطِ مستقیم پر لے جاتا ہے آخر میں جا کے۔

قرآن نے کہا ہے جو ہمارے بارے میں محنت کرتا ہے ہم اس کو سبلنا اپنے سبل دکھاتے ہیں۔ عزیزانِ من! عجیب چیزیں ہیں کیا عرض کروں؟ اور وہ وقت کی کیفیت یہ ہے کہ وہ وہ لگام کھینچ رہا ہے میری۔ ہم انہیں اپنے سبل دکھا دیتے ہیں۔ سبل کہتے ہیں ان پگڈنڈیوں کو جو آخرالامر جا کے ہائی وے روڈ میں مل جائیں۔

جو ہمارے بارے میں جھد جدوجہد کرتے ہیں ہم ان کو سبل دکھاتے ہیں اور یہ سبل جو ہیں یہ پھر جا کے آخرالامر وہیں جا ملنا ہے ایک دور آنا ہے جہاں فکرِ انسانی علمِ انسانی اپنی محنت' کاوش' تجسس' تجربات' مشاہدات' مطالعات کے بعد ان حقائق تک پہنچ جائے گا کہ جو وحی نے عطا کیے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے اس نے چودہ سو سال پہلے عطا کیے کہ انسان کی محنت بچ جائے یہ لاکھوں سال کی محنت کے بعد ہڈیاں تڑوا کر آگ اور خون کی ندیاں پار کر کے' کئی کئی عظیم جنگوں کے بعد' کسی ایک حقیقت کے اوپر پہنچے گا۔ پہنچے گا ضرور۔ اللہ نے اس شخص (اقبالؒ) کو کیا خوب انداز دیا تھا بات سمجھنے کا اور کہنے کا!

ہر دو امیرِ کارواں ہر دو بمنزل رواں
عقل بہ حیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

تنہا عقلِ انسانی اور وحی میں زمین و آسمان کا فرق ہے:

عقل اور وحی دونوں امیرِ کارواں ہیں دونوں منزل کی طرف جا رہے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ یہ اسباب' ذرائع TRIAL & ERROR کے طریقے سے لے جاتی ہے اور عشق کھینچ کے لاتا ہے۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیے قصے تمام
اس زمین و آسمان کو بے کراں سمجھا تھا میں

وحی یہ کرتی ہے صاحب۔ حضرتِ موسیٰؑ کو جو آواز آئی ہے وہاں وحی کی اور وہاں کہا یہ تھا کہ موسیٰؑ! فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ

اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (20:12) موسیٰؑ! اب اپنی جوتیاں اتار دے تیری مسافتیں اب سمٹ کے طے ہوگئی ہیں وحی کے ذریعے سے وہ حقائق لے جن کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا اب تمہیں صحرا نوردیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآنِ کریم نے حضور ﷺ کے متعلق فرمایا کہ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ (93:7) ہم نے تجھے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا' لیجیے! حقیقت تمہارے سامنے آ گئی۔

وحی تو انسانیت کے بوجھ کو ہلکا کر دیتی ہے:

اقبالؒ کے الفاظ میں REVOLUTION یا وحی IT ECONOMISES HUMAN EFFORTS ' اکانومائز کرتی ہے انسانی جدوجہد کو۔ اس لیے اس مقام پہ وہ یہ کہتے ہیں غلط قدم اٹھ گیا پتہ نہیں کہاں نکل جائیں گے ہم پھر کتنی صدیاں لگ جائیں گی ہمیں صحیح راستے کے اوپر آنے پہ تو کیوں خوامخوہ کے لیے اتنا وقت اور توانائیاں ضاء کیا جائے؟ وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً (3:8) اپنی طرف سے جو تم نے ہدایت کا سامان بھیجا ہے وہ ہمیں اس مقام کے اوپر عطا کر دے۔

عزیزانِ من! اگر یہ جو سامانِ ہدایت عطا ہوا تھا اور ایک جھلک اس کی دیکھی ہے زمانے کی آنکھ نے کہیں اسی ہدایت کے اوپر یہ کارواں جسے امتِ محمدیہ ﷺ کہتے ہیں یہ چلتا رہتا معلوم نہیں آج انسانیت کہاں ہوتی۔ ہم ایک چاند کے اوپر دو انسانوں کے پہنچنے کے اوپر جشن منا رہے ہیں معلوم نہیں کہ یہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں وہاں تک آج انسانیت کا کارواں پہنچا ہوتا۔ یہ انسانیت کے خلاف جو جرم ہے اس کے مجرم ہم ہیں جنہوں نے کتاب کا وارث ہونے کا دعویٰ کیا ہوا ہے۔ وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (3:8) یہ ہدایت جو ہے جو یوں ملتی ہے بجلی کی چمک کی طرح سے راستے کو روشن کرنے والی یہ تو ہی دے سکتا ہے ہم اپنی فکر کے راستے سے اگر چلے بڑی لمبی راہیں ہوں گی بڑے سامانِ ہلاکت راستے میں آئیں گے پھر کہیں جا کے معلوم نہیں آج کا چلا ہوا انسان کب جا کے وہاں پہنچے گا۔ اور تو اگر یہاں ایک جھلک اپنے نور کی قرآن کے ذریعے سے دیدے گا قدم صحیح راستے پہ اٹھ جائے گا وہی منزل جو صدیوں میں طے ہونی تھی دنوں کے اندر طے ہو جائے گی۔

عزیزانِ من! ہم سورۂ آلِ عمران 7 تک آ گئے وقت ہو گیا ورنہ بات تو ابھی اور آگے چلنی تھی۔ بہرحال اگلے درس میں بھی میں دو ایک لفظ اسی کے متعلق عرض کروں گا باقی ہیں دو ایک چیزیں۔ قرآن نے اپنے آپ کو پورے قرآن نے اپنے آپ کو محکمات کہا ہے متشابہات بھی دوسری جگہ کہا ہے میں عرض کروں گا کہ ان کے معنی کیا ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نکتۂ شرعِ مبین

علامہ محمد اقبالؒ نے مثنوی پس چہ باید کرد‘‘ کے باب نمبر 9۔۔۔ دراسرارِ شریعت میں فرمایا ہے:

کس نگردد در جہاں محتاجِ کس نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

’’کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس‘‘ اسے علامہ محمد اقبالؒ نے ’’شرعِ مبیں‘‘ کے حوالہ سے پیش کیا ہے لہٰذا پہلے ہمیں شرعِ مبیں کو دیکھنا ہوگا۔ یہ شرعِ مبین، اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآنِ مجید ہے۔ اس میں ارشاد ہے:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿79﴾ (3:79)

مفہوم: کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین، حکومت اور نبوت عطا کر دے، اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کے احکام کی جگہ میرے احکام کی اطاعت کرو۔ اس کی تعلیم یہی ہوگی کہ تم سب، اس کتابِ خداوندی کی اطاعت سے، جس کی تم دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور، جس پر غور و فکر سے اس کے مقاصد تک پہنچتے ہو، ربانی (یعنی اس کے نظامِ ربوبیت کے علمبردار) بن جاؤ۔ (3:79)

یہ نظامِ ربوبیت کیا ہے۔ اس کے بنیادی خدوخال کیا ہیں، اسے قرآن کریم نے بالوضاحت بیان فرمایا ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿40﴾ (12:40)

مفہوم: اختیارات و اقتدارات کا واحد مالک خدا ہے۔ اس کے سوا حکومت کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ اس کا فرمان یہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اور اطاعت اختیار نہ کی جائے۔ یہ ہے زندگی کا محکم اور استوار

---

(1) اسی نکتۂ شرعِ مبین کو حضرتِ علامہؒ نے درج ذیل مقامات پر بھی دہرایا ہے:

کس دریں جا مسائل و محروم نیست عبد و مولا حاکم و محکوم نیست
بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام نے غلام اُورا نہ اُو کس را غلام
(جاوید نامہ، فلکِ عطارد، حکومتِ الٰہی)

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیر رہ نشیں
(ابلیس کی مجلس شوریٰ، ارمغانِ حجاز)

نقشہ۔لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

اس حکومتِ الٰہی کی عملی صورت کیا ہے۔فرمانِ خداوندی ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ط ۔۔۔(5:48)

مفہوم: ہم نے تیری طرف یہ کتاب نازل کی ہے جو تمام ٹھوس حقیقتوں کو اپنے آغوش میں رکھتی ہے۔اُن تمام وعدوں اور دعووں کو سچ کر کے دکھانے والی ہے جو کتبِ سابقہ میں کئے گئے تھے اور اس اصولی تعلیم کی جامع اور نگران ونگہبان ہے جو اس سے پہلے وقتاً فوقتاً دی جاتی رہی ہے اور جس کا ہمیشہ کے لیے غیر متبدل رکھنا مقصود ہے۔لہٰذا اب تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے اسی کتاب (مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ) کے مطابق کرو۔اور اس قسم کے حقائق مل جانے کے بعد، لوگوں کے خیالات اور خواہشات کے پیچھے مت چلو۔

حکومتِ الٰہیہ دراصل ''بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ'' کے مطابق حکومت کرنے کا دوسرا نام ہے یہ بنیادی طور پر خدا کے رسول کی ذمہ داری ہوتی تھی۔عملی طور پر ایک رسول، خدائی احکام کی اطاعت کراتا تھا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ط (4:64)

ترجمہ: اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لیے کہ اطاعت کی جائے اس کی اللہ کے حکم سے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ج (4:80)

ترجمہ: جس نے اطاعت کی رسولؐ کی سو درحقیقت اطاعت کی اس نے اللہ کی۔

حکومتِ الٰہیہ جس میں ''عبد ومولا، حاکم ومحکوم'' نہیں ہوتے، وہ کیا ہوتی ہے، مندرجہ بالا آیات اور ''شرعِ مبیں'' کی روشنی میں اس کی وضاحت جناب قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اگست 1941ء میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، دکن کے طلبا کے ایک سوال کے جواب میں کردی تھی۔انہوں نے فرمایا تھا کہ:

''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام واصول ہیں۔اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست ومعاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی کا نام ہے اور حکمرانی کے لیے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔''

(بحوالہ اورینٹ پریس آف انڈیا)

اسلامی حکومت کا قیام، پیغمبرِ اعظم ﷺ کا فریضہ تھا۔ان کا کام قرآنی اصول واقدار کے معاشرہ اور مملکت میں نفاذ پر منحصر

تھا۔ جہاں قرآنِ کریم نے اصول واقدار کی جزئیات متعین نہیں تھیں، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں مشورہ کا حکم دیا تھا:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ (3:159)

ترجمہ: اور مشورہ لیتے رہو ان سے دین کے کام میں۔ پھر جب پختہ فیصلہ کرلو۔ تو توکل کرو اللہ پر۔

یہ اسلامی نظامِ حکومت نبی کریم ﷺ کے بعد بھی جاری رہنا تھا (3:144)

امتِ محمدیہ اور خلیفۃ الرسول کو بھی قرآنی احکام کی اطاعت کرنے اور جہاں تفصیلی احکام نہ ہوں، وہاں مشورہ سے معاملات نمٹانے کا حکم ہے:

وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ۖ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ۖ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿٣٨﴾ (42:38)

مفہوم: وہ لوگ جو خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں، وہ خدا کے قوانین کی اطاعت کرتے اور نظامِ صلوٰۃ پر کاربند رہتے ہیں جو انہیں یہ سکھاتا ہے کہ تمام امور کے فیصلے، قوانین خداوندی کی حدود میں رہتے ہوئے، باہمی مشاورت سے ہونے چاہئیں اور جو سامانِ زیست انہیں حاصل ہو (اس میں سے بقدر اپنی ضروریات کے رکھ کر باقی) نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لیے کھلا رکھتے ہیں۔

شرعِ مبین کے نظام میں چونکہ احکامِ خداوندی پر عمل ہوتا ہے اس لئے اس میں کسی فرد، ادارہ یا ڈکٹیٹر کی اطاعت نہیں ہوتی۔ اسلامی حکومت خدائی اصول واقدار کے نفاذ کی ایجنسی ہوتی ہے اور بس۔ اس لیے اس میں عبد و مولا، حاکم و محکوم کی تمیز نہیں ہوتی۔

جہاں تک ''کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس'' کا سوال ہے اور خصوصاً حکومتِ الٰہیہ میں ''کس دریں جا سائل و محروم نیست'' کا تعلق ہے، اسے ذرا گہری نظر سے دیکھنا ہوگا۔

علامہ محمد اقبالؒ نے اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اپنی کتاب ''علم الاقتصاد'' جو 1903ء میں شائع ہوئی تھی، کے دیباچہ میں لکھا تھا:

> اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سیلِ رواں میں اصولِ مذہب بھی بے انتہا مؤثر ثابت ہوئے ہیں مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہوئی ہے کہ روزی کمانے کا دھندہ، ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے سے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی، یا یوں کہو کہ ضروریاتِ زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے، غریبی قویٰ انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلّا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلم اوّل یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدنِ انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے مگر مذہب اور زمانۂ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوتِ

مدارج، بجائے اس کے کہ قیامِ تمدن کے لئے ایک ضروری جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہوجائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحہ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔

اس کا حل قرآنی نظامِ ربوبیت نے دیا ہے کہ خدا کے نام پر اور اس کے احکام کے مطابق قائم ہونے والی حکومتِ الٰہیہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ہر متنفس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کی ذمہ داری لے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ (11:6)

مفہوم: روئے زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا نے نہ لے رکھی ہو۔ اس لئے وہ جانتا ہے کہ ایک ذی حیات کو کسی ایک منزل میں ٹھہرنے، اور قانونِ ارتقاء کی رُو سے، اگلی منزل تک پہنچنے کے لئے کس قدر، اور کون کون سے سامانِ نشوونما کی ضرورت ہوگی۔ یہ سب کچھ خدا کے قانونِ مشیت کی کتاب میں واضح طور پر درج ہے لہٰذا منشائے خداوندی کو پورا کرنے والا نظام وہی ہوسکتا ہے جس میں کوئی ذی حیات رزق سے محروم نہ رہنے پائے۔ جو نظام، خدا کی ان ذمہ داریوں کو پورا کرے گا، وہی نظامِ خداوندی کہلا سکے گا۔

(تفصیل کے لئے دیکھیں 6:152، 29:60، 41:10)

یہاں ایک بات کی وضاحت قرآن نے خود بتائی ہے کہ چونکہ انسان کو اختیار وارادہ کی فضیلت سے سرفراز کیا گیا ہے، اس لیے خدا تعالیٰ کی فراہمیٔ رزق کی ذمہ داری انسانی دنیا میں خود انسانوں کے ہاتھوں پوری ہوگی۔ وہ اس طرح کہ انسان اپنے اختیار وارادہ سے وحی کی رُو سے جو خدا تعالیٰ نے نظام بتایا ہے، اسے اپنے معاشرہ میں نافذ کریں اور خدائی اصول واقدار کی پاسداری کریں تو یہ نظام خدائی ذمہ داریوں کو پورا کرے گا۔ ارشاد ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (36:47)

مفہوم: جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو سامانِ زیست تمہیں خدا کے ہاں سے ملا ہے، اسے حاجتمندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لیے کھلا رکھو، تو جو لوگ خدا کے نظامِ ربوبیت سے انکار کرتے ہیں، وہ، ان لوگوں سے جو اس نظام پر ایمان رکھتے ہیں، کہتے ہیں کہ اگر خدا کی منشاء یہی تھی کہ رزق کی تقسیم اس طرح ہو کہ دنیا

میں کوئی بھوکا نہ رہے تو اس نے خود ہی ایسا انتظام کیوں نہ کر دیا؟ انسانوں سے کیوں کہا کہ تم ایسا معاشرہ قائم کرو جس میں ہر ایک کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہیں۔۔۔ انہیں کون بتائے کہ ایسا کہنے میں یہ کس قدر غلطی کرتے ہیں۔ انسانی معاشرہ میں خدا اپنے نظام کو انسانی ہاتھوں ہی سے قائم کرایا کرتا ہے۔ یہ اپنی ذمہ داری سے بچنا چاہتے ہیں۔ یہ ان کی بہت بڑی غلط نگہی ہے۔ یہ اپنے ہر عمل کے خود ذمہ دار ہیں۔

(تفصیل کے لیے دیکھیں: 6:149، 16:35، 43:20)

حکومتِ الٰہی کی اس ذمہ دار کو پورا کرنے کے لیے صاحبِ ایمان لوگوں کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ اپنے مال و دولت اور حاصلِ معاش کو سمیٹ کر اپنے اور اپنوں کے لیے ہی نہ رکھ لیں بلکہ انسانی مشکلات کی کشاد کے لیے اسے کھلا رکھیں اور دوسروں کی نشوونما کے لئے دیں۔

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ۬ؕ (3:92)

ترجمہ: تم کشاد کی پوزیشن پر ہرگز نہیں پہنچ سکتے جب تک تم خدا کی راہ میں وہ کچھ نہ کھلا رکھو جو تم محبوب رکھتے ہو۔

وَیَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ ۬ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ ؕ (2:219)

اور آپ سے پوچھتے ہیں کہ کس قدر اللہ کی راہ میں کھلا رکھیں۔ آپ کہئے کہ ضرورت سے زائد سب کا سب۔

علامہ محمد اقبالؒ نے اس مضمون کو کئی طرح باندھا ہے۔ میں ایک آدھ مقام آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو — لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا

بامسلماں گفت جاں برکف بنہ — ہر چہ از حاحت فزوں داری بدہ

(جاوید نامہ)

یہ مؤمنوں کے ساتھ ایک معاہدہ کی رو سے ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَاَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَیُقۡتَلُوۡنَ ۟ وَعۡدًا عَلَیۡہِ حَقًّا فِی التَّوۡرٰىۃِ وَالۡاِنۡجِیۡلِ وَالۡقُرۡاٰنِ ؕ (9:111)

مفہوم: جماعت مومنین کا نظامِ خداوندی کے ساتھ ایک اہم معاہدہ ہوتا ہے۔ اس معاہدہ کی رُو سے، نظامِ خداوندی ان کا مال اور جان خرید لیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں انہیں جنت کی زندگی کی ضمانت دے دیتا ہے (یعنی اس دنیا میں ان کی تمام ضروریاتِ زندگی کہ بہم رسانی اور ان کی صلاحیتوں کے نشوونما پانے کے تمام وسائل و اسباب کی فراہمی، اس نظام کے ذمے ہو جاتی ہے۔) اس معاہدہ کے بعد وہ اپنی، اپنے متعلقین کی ضروریاتِ زندگی کی طرف سے مطمئن ہو جاتے ہیں، اور نظامِ خداوندی کے استحکام کی خاطر، عندالضرورت جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں نکل آتے ہیں۔ پھر یا تو دشمن کو قتل کر کے فاتح و منصور واپس آتے ہیں، یا خود اپنی جان دیدیتے ہیں اور مرنے کے بعد جنت کی زندگی حاصل کر لیتے ہیں۔

یہ معاہدہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ سابقہ آسمانی کتابوں ___ تورات وانجیل میں بھی مذکور تھا اور اب اسی کی تجدید قرآن میں کی گئی ہے۔ اس عہد کا پورا کرنا اللہ نے خود اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔۔۔

جیسا کہ آیۂ مذکورہ سے ظاہر ہے، اس اسلامی معاشرہ کے قیام کی ذمہ داری، خود مومنین پر عائد ہوتی ہے اس لئے خدا کا وعدۂ مومنین کے اعمالِ صالحہ کے ساتھ مشروط ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (24:55)

مفہوم: اللہ نے ان لوگوں سے جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں اور اس کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ اللہ انہیں اس زمین میں حکومت عطا کرے گا۔ جیسے اس نے سابقہ اقوام کو بھی اسی قسم کی حکومت (تمکن فی الارض) عطا کی تھی اور ان کے اس نظامِ زندگی کو مستحکم کر دے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کا خوف امن سے بدل جائے گا تاکہ وہ نہایت اطمینان سے اُس کے اور صرف اس کے قوانین کی اطاعت کریں اور ان پر کسی قسم کا جبر یا دباؤ نہ ہو کہ وہ اس کے ساتھ کسی اور کی بھی اطاعت کریں، اور اس طرح شرک کے مرتکب ہوں۔

یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک یہ لوگ اللہ کے قوانین پر عمل پیرا رہیں گے۔ جو لوگ ایسا نظام قائم ہو جانے کے بعد اس سے عملاً انکار کر دیں (اور احکام خداوندی کے بجائے، اپنے احکام نافذ کرنے لگ جائیں گے تو یہ لوگ اس شاہراہِ حیات کو چھوڑ کر جو انہیں صحیح منزل کی طرف لئے جا رہی تھی، اور راہوں کی طرف نکل جائیں گے اور اللہ کے وعدہ کا استحقاق کھو دیں گے۔)

یہاں ایک خطرناک گھاٹی ہے۔ مذہب پرست طبقہ، نظامِ اسلامی یا حکومت الٰہیہ میں زندگی بسر کرنے کے بجائے، انسانوں کو انفرادی نجات پر لگا دیتا ہے اور عبادات وارکان کی ظاہری صورت کی ادائیگی کو ہی اسلامی زندگی قرار دیتا ہے۔ اپنی زندگیوں کو قرآنِ کریم اور منزل من اللہ کے مطابق ایک معاشرتی نظامِ حکومت کے تابع گزارنے کو ضروری قرار نہیں دیتا۔ صرف عبادات کی ادائیگی کو ہی اسلام کی اصل صورت سمجھ لیتا ہے۔ علامہ محمد اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

قرآنِ کریم نے اس کی واضح نشاندہی کی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا

بَعِيْدًا ﴿۶۰﴾ (4:60)

مفہوم: ان لوگوں کی حالت قابلِ غور ہے جن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ قرآن پر اور کتبِ سابقہ پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے سرکش قوتوں (الطاغوت) سے کروائیں۔ حالانکہ ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ قرآن پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ہر غیر خدائی نظام وقانون سے انکار کر دیا جائے اور شیطان چاہتا یہ ہے کہ انہیں راہِ ہدایت سے بھٹکا کر کہیں کا کہیں لے جائے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿۶۱﴾ (4:61)

مفہوم: جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اپنے معاملات کے فیصلے کے لیے مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (خدا کے قانون) اور اس کے عملاً نافذ کرنے والے رسول کی طرف آؤ تو جیسا کہ (اے رسولؐ) تم دیکھتے ہو، یہ لوگ تم سے اعراض برتتے ہیں اور معاملات کے فیصلے کے لئے تمہاری طرف آنے سے رُک جاتے ہیں ___ یہ ایمان نہیں، مفافقت ہے۔ کفر ہے۔ اس لئے کہ جو لوگ قرآنِ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔ (5:44)

شرعِ مبین کے اس نکتہ کی وضاحت کے لیے علامہ محمد اقبالؒ نے ''آل انڈیا مسلم لیگ'' کے جلسہ منعقدہ الٰہ آباد 1930ء میں فرمایا تھا:

''حقیقت یہ ہے کہ اسلام، خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے جس کی ہیئت ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عملِ خیر کو اپنے اندر جذب کرے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی رُوسو کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح پابہ گِل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اس سے، بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو۔ وہ ایک فعال مشینری کا پرزہ ہوتا ہے اور اسے ٹھیک انداز سے چلانے کے لیے اس پر حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔''

یہ ہے برادرانِ عزیز وہ نظام جسے شرعِ مبین یعنی قرآن کریم، خود انسانوں کے ہاتھوں، ان کے ایمان و عملِ صالح کی بنا پر قائم کروانا چاہتا ہے اور جس کا مقصود یہ ہے کہ ؎

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس اور

کس دریں جا سائل و محروم نیست عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

(مندرجہ بالا خطاب، دبستانِ اقبال، گلبرگ لاہور کے اجلاس مورخہ 28 جنوری 2017ء میں پیش کیا گیا تھا)

یوسف سیجا، کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قرآن سے اسلام کے صحیح تصور کا حصول

(پرویز صاحب کی کتاب قرآنی فیصلے میں سے لیا گیا مختلف مقامات سے مواد جس میں میں نے اپنے جملے بھی شامل کیے ہیں۔)

جب دین کا لفظ ہمارے سامنے آتا ہے تو سب سے پہلی چیز القران والحکیم جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن وساطت سے نوع انسانی کو ملا ہے، سامنے ملتا ہے۔ قرآن کے بعد تاریخ دین ہمارے سامنے آتی ہے۔ دین کی تاریخ سے مراد یہ ہے کہ عہد رسول اللہ والذین معہ میں قرآنی نظام کس طرح متشکل ہوا تھا۔ قرآن بھی آپ کو کتابی شکل میں دیا گیا ہے جو آپ کے سامنے موجود ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالی نے لی ہوئی ہے۔ جو حقیقت ثابتہ ہے۔ ایک یقینی صحیفہ ہے۔ جس کا ایک ایک لفظ بعینہ وہی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے لکھوایا گیا تھا۔ اس میں نہ کسی شک وشبہ کی گنجائش ہے اور نہ کسی ردو بدل کا امکان ہے۔ لہذا جو چیز قرآن میں تھی وہی قرآن میں ہے۔ اسی قرآن کو بلا توقف وتامل حتمی اور یقینی تصور کرنا ہوگا۔ یہ ایک مسلمان کا ایمان ہے جس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں ہوسکتا ہے۔ دوسری طرف قرآن کے بعد تاریخ دین ہمارے سامنے آتی ہے۔ تاریخ دین کی کتابوں میں کتب احادیث کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کتب احادیث کی صحت کو عقیدے میں شامل کرلیا گیا ہے۔ عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ صحیح کتب صحیحین ہیں۔ اب کتب احادیث وروایات اور سیر اس کے علاوہ دیگر تاریخ پر لکھی جانے والی کتب جس انداز سے اور جس زمانے میں مرتب ہوئی ہیں۔ وہ زمانہ ہی اس پر شاہد ہے کہ انہیں کس حد تک حتمی اور یقینی کہا جاسکتا ہے۔

عہد رسالت مآب سے قریباً سوا دوسو سال بعد مرتب ہونے والے مواد کا تمام تر مدار روایات پر مبنی ومشتمل تھا۔ قرآن کے مقابلے میں تاریخ کی ان صحیح ترین کتابوں کے حتم اور یقین کی حیثیت کو متعین کرنا کوئی ناممکن کام نہیں ہے۔ مشکل اس لئے ہے کہ ہم نے اسے عقیدے کی حیثیت دے دی ہوئی ہے۔ ورنہ تو تاریخ ظنی ہے۔ ایک ظنی چیز کو یقینی چیز کے سامنے کیسے کھڑا

کیا جا سکتا ہے۔ کتب روایات وسیر کو قرآن کی طرح مرتب نہیں کیا گیا تھا۔ ان کا زمانہ بھی قرآن کے زمانے کے بعد کا ہے۔ مرتبین نے بھی اسے یقینی نہیں کہا ہے۔ لہذا یہ ظنی ہے اور یہ سب مانتے ہیں کہ تاریخ ایک ظنی علم ہے۔

اس طرح کتب روایات وسیر تاریخ ہیں۔ دنیا کو تاریخ کے علم کی اپنے نظام کی خاطر بہت زیادہ ضرورت اس لئے ہے کہ ان کے پاس یقینی علم کا کوئی ذریعہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ اور ہم مسلمانوں کی خوش نصیبی یہ ہے کہ ہمارے پاس یقینی علم کا ایک ذریعہ قرآن مجید کی شکل میں موجود ہے۔ لہذا ہم تو بہر حال اور بہر نوع یقینی ذریعہ کو ہی صحیح تسلیم کریں گے۔ لیکن ہماری بدبختی یہ ہے کہ ہم نے ظن کو یقین پر غالب قرار دے رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارا دین یکسر ظنیات کا مجموعہ بن چکا ہے۔

دین کے یقینی علم کو دین کے ظنی علم سے اپنی صوابدید کے مطابق صحیح سمجھ کر آج اگر کوئی ایک جدید مجموعہ احادیث مرتب کرے اور لوگ اس مجموعے کو اقوال رسول اللہ ﷺ کہیں اور سمجھیں اور اس طرح اس قسم کے مجموعے کو شرعی حیثیت حاصل ہو جائے تو یہ بھی ایک انفرادی کوشش کا کسی فیصلے کو امت کے لئے شریعت بنانے کے مترادف ہوگا۔ اور یہ حق کسی فرد کو کیسے حاصل ہوسکتا ہے۔ یہ کام بین المللی حیثیت سے کرنے کا ہے۔

یہ کام اسلامی حکومت (خلافت علی منہاج رسالت) کے کرنے کا کام ہے۔ اس کا یہ کام ہے کہ وہ ایک مستند تاریخ مرتب کر کے امت کے لئے اسے بطور نصاب مقرر کر دے اور باقی کتب تاریخ کے متعلق فیصلہ صادر کر دے کہ وہ غیر مستند ہیں۔ فقہ اور روایات کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لے کر اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قوانین مرتب کرے۔ کہ اب یہ قوانین شرعی حیثیت رکھیں گے۔ دین کی حیثیت صرف قرآن کو ملنی چاہئے۔ قرآن ہی یقینی علم ہے۔ اس دنیا میں قرآن کے علاوہ کسی علم کو بھی یقین کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ تمام کے تمام علم کسب وہنر سے حاصل کئے جاتے ہیں۔

انسان اپنے حسی قلبی نفسی نظام کو بروئے کار لا کر علم حاصل کرتا ہے۔

میں (پرویز) اپنی بصیرت کے مطابق اسلام کے اس تصور کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جسے قرآن کریم نے متعین کیا ہے۔ مجھے اس پر اصرار نہیں کہ میرے پیش کردہ تصور ہی کو صحیح تسلیم کیا جائے۔

میری دعوت یہ ہے کہ قوم کے ارباب فکر ونظر سر جوڑ کر بیٹھیں اور قرآن کریم سے اسلام کا واضح اور متعین تصور متشکل کر کے اسے قوم کے سامنے بطور نصب العین رکھیں۔ اور پھر اس نصب العین کی طرف بڑھنے کے لئے عملی ذرائع اختیار کریں۔ اگر ہم اسلامی معاشرہ متشکل کرنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں اسلام کا ایک واضح اور متعین تصور مرتب کر کے اسے بطور نصب العین سامنے رکھنا ہوگا۔

راجہ عبدالعزیز (دھیرکوٹ، آزاد کشمیر)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(دوسری قسط)

متحرک نفسیات

Dynamic Psychology

قرآنِ کریم میں بیان کئے گئے ''دِلوں کے عوارض'' کو ماہرین طب نفسی (Psychiatrists) نے ذہنی ونفسیاتی امراض سے تعبیر کیا ہے۔ اِن بیماریوں کی اقسام بتائی ہیں اوران کی درجہ بندی کی ہے۔ ابتداء امریکی ماہرین نفسیات نے کی اور تشخیص اور شماریاتی کتابچہ برائے ذہنی امراض (Diagnostic and statistical manual of mental disorders) کی تین فہرستیں شائع کرائیں لیکن پھر بھی اتفاق نہ ہوسکا۔ ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں کی درجہ بندی کے لئے عالمی ادارہ برائے صحت (W.H.O) نے بھی تمام دنیا میں پائی جانے والی ذہنی وجسمانی بیماریوں کی جامع درجہ بندی کی ہے۔ ماہرین کے سات برس کے کام اور مذاکرات کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام موجود ذہنی علامات کی ایک مکمل فہرست سامنے آئی۔ اس درجہ بندی کو بین الاقوامی شماریاتی فہرست برائے امراض، زخم وموت (International statistical classification of diseases, injureis and cause of death) کہا جاتا ہے مخفف کے طور پر اسے (ICD-9) کہا جاتا ہے۔ اس فہرست کا ایک حصہ ذہنی ونفسیاتی امراض کی درجہ بندی پر مشتمل ہے اور دنیا بھر کے ماہرین طب نفسی اسی کے مطابق تحقیق وتفتیش کرتے ہیں۔ آئی سی ڈی 9 تمام ذہنی بیماریوں کو چار واضح گروہوں میں تقسیم کرتی ہے۔ اول۔ عضوی اختلال ذہنی (Organic psychotic condidtions) دوم۔ دیگر اختلال ذہنی (Other Psychoses) سوم۔ اعصابی خلل، شخصیاتی خلل اور دیگر غیر اختلالی ذہنی خلل (Neurotic disorders, Personality disorders, and other Non-Psychotic mental disorders).

چہارم۔ ذہنی ابطاء (Mental Retardation)۔ آگے ان گروہوں میں شامل بیماریوں کی ایک طویل فہرست ہے جن میں چند امراض یہ ہیں۔ کبرسنی اور قبل کبرسنی، عضوی اختلال وذہنی کیفیات، ادویات یا منشیات سے متعلق اختلالِ ذہنی، الکحل سے متعلق اختلال ذہنی، عصابی یا نیوراتی (Neurotic) خلل، شخصیاتی خلل، جنسی عارضے اور انحراف، الکحل پر انحصار کی علامت، ذہنی وجوہات سے پیدا شدہ فعلیاتی خلل، اشقاق ذہنی، تحسیسی اختلال، خبط عظمت، دماغی گزند، کردار کے غیر متذکرہ

اضطراب، بچپن اور جوانی کے مخصوص جذباتی اضطراب، جسمانی بیماریاں جو نفسیاتی وجوہات کی بنا پر ہوں، معمولی ذہنی پسماندگی اور مخصوص وغیر مخصوص ذہنی پسماندگی وغیرہ وغیرہ۔ ان میں ہر ایک قسم کی مزید مختلف اقسام کا بھی ذکر ہے جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ اور ہر قسم کی تفصیلی بحث الگ الگ ہے۔

مثلاً نیوراتی امراض کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو اس کے تحت تشویش (Anxiety) بے جا خوف (Fobic state) خبط (Obsession) اجبار (Compulsion) خبطی اجبار (Obsessive Compulsion) اور اختناق (Hyesteria) وغیرہ جیسی ذہنی بیماریاں آتی ہیں۔ ان نفسیاتی بیماریوں کی تفصیل میں جائیں تو مزید ذہنی اختلال کا انکشاف ہوتا ہے۔ ان ذہنی ونفسیاتی بیماریوں میں ایک بڑی بیماری حزن (Fear and grief) کا مرض ہے۔ قرآن مجید کے مطابق اللہ نے ہبوط آدم کے وقت فرمادیا تھا کہ انعاماتِ خداوندی کے رواں چشمے کو تقسیم کر کے اور تیری اور میری کا سوال پیدا کر کے انسان بلند مقام سے پست سطح پر تو آ گیا ہے لیکن اس کی یہ گراوٹ ابدی نہیں۔ ''ہماری طرف سے تمہیں راہنمائی (ہمارے رسولوں کی معرفت) ملتی رہے گی۔ سو جو بھی اس راہنمائی کا اتباع کرے گا تو وہ لوگ خوف وحزن سے مامون اور محفوظ ہو جائیں گے'' 2:38۔ یہاں اتباع ہدایت کا نتیجہ خوف وحزن سے مامونیت بتایا گیا ہے۔ خوف عام طور پر بیرونی خطرات اور نقصانات کے احساس کو کہا جاتا ہے، اور حزن کے معنی ہوتے ہیں، افسردگی، پژمردگی، پریشانی، عرب اس لفظ کو معاشی پریشانی کے لئے خاص طور پر بولتے تھے۔ علم النفس کی تحقیق کے مطابق بھی اکثر نفسیاتی الجھنوں اور اعصابی عوارض کا بنیادی سبب خوف ہے۔ اس کے علاوہ خوف سے انسانی ذات (نفس) میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ حزن ہوتا ہے۔ قرآن پاک نے قوانین خداوندی پر مبنی نظام کی بنیادی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں انسان کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ حزن۔ ''جو شخص قوانین خداوندی کی صداقتوں کو تسلیم کر کے، ان کے مطابق صلاحیت بخش کام کرے گا تو اسے نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن ہوگا۔'' ''اسے نہ کسی قسم کی ناانصافی اور دھاندلی کا خوف ہوگا نہ استحصال کا ڈر 20:112۔'' ''اسے نہ اپنے حقوق میں کمی یا سلب ونہب کا اندیشہ ہوگا اور نہ کسی ذلت ورسوائی کا خوف'' 72:13۔ جنتی زندگی، چاہے اس دنیا میں ہو یا آخرت میں اس کو کسی قسم کا خوف وحزن لاحق نہیں ہوتا 7:49، 43:68۔ یہی وہ خوش نصیب ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنا دوست کہا ہے 10:62۔ یعنی ''وہ لوگ جو اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے اور پھر وہ اپنے اس اقرار پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہیں کر سکتی'' 41:31-32۔

قرآن پاک نے منافقت کو نفسیاتی مرض قرار دیا ہے 2:10۔ ماہرین نفسیات کے مطابق نفسیاتی امراض کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب تک ان کی اصل علت (Cause) معلوم نہ ہو جائے، نہ صرف یہ کہ ان کا ازالہ نہیں ہوتا بلکہ ہر غلط علاج سے مرض اور بڑھتا ہے جیسے کہ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے دس اور جھوٹ بولنے پڑتے ہیں اور یوں یہ مرض بڑھتا چلا

جاتا ہے اور کذب اور جھوٹ ان کا شعار بن جاتا ہے۔ کفر کا بنیادی تعلق انسانی فہم وادراک (نفسیات) کی غلطی یا غلط نگہی سے ہے اس لئے اس نفسیاتی بیماری سے پیدا ہونے والے کرب واضطراب کو قرآن مجید نے عذاب الیم 2:10 کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی بقول پرویز صاحب! ''اگر کفر کا نتیجہ دردِ سر ہے تو منافقت کا نتیجہ دردِ جگر''۔ ماہرین کے مطابق خوف وتشویش نیوراتی امراض کی اولین اور سب سے زیادہ تعداد میں پائی جانے والی قسم ہے۔ تشویش کا مریض اپنی زندگی کا زیادہ حصہ کسی انجانے خوف میں گزار دیتا ہے۔ بعض اوقات یہ خوف وفکر کوئی مخصوص شکل بھی اختیار کر لیتا ہے' مثلاً اگر کسی شخص کو ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہے کہ وہ اپنی عزیز ترین متاع سے ہاتھ دھو بیٹھے گا تو اِس کے اس ذہنی عمل کو نیوراتی مرض (Neurotic disorder) کہا جائے گا۔ کسی حقیقی خطرے کو سامنے دیکھ کر تشویش پیدا ہو جانا ایک قدرتی عمل ہے اور اپنے بچاؤ کا مناسب بندوبست کرنے کی خاطر ایسا ہونا لازمی بھی ہے۔ یہ بیماری کے زمرے میں نہیں آتی۔ اس کے برعکس ایک نیوراتی مریض میں کسی حقیقی خطرے کے بغیر تشویش پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے ماہرین نے نیوراتی تشویش اور عام تشویش میں فرق کیا ہے۔ ایک اور فرق ان میں یہ ہے کہ عام تشویش حالات کے تبدیل ہونے سے ختم ہو جاتی ہے جبکہ نیوراتی مریض پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اسی طرح بے جا خوف (Phobic state) میں مبتلا مریض فرضی چیزوں یا خطرات سے ڈرنے لگتا ہے۔ مثلاً سرخ پھول دیکھ کر' کسی کتاب کا صفحہ نمبر 19 دیکھ کر' معصوم چڑیا کی تصویر دیکھ کر' ریل کی سیٹی کی آواز سن کر' اونچی بلڈنگ سے نیچے دیکھ یا موٹر کی اگلی سیٹ پر بیٹھ کر' ڈر کر تھر تھر کانپنے لگتا ہے۔ بے جا خوف ہزاروں صورتیں اختیار کر سکتا ہے۔ ابھی تک خوف و تشویش کی مختلف شکلوں کی باقاعدہ فہرست سامنے نہیں آئی۔

اس کی وجہ سے نیوراسس (Neurosis) اور شدید جذباتی ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس کا اخراج ونکاس نامعلوم رہتا ہے اور تشویش کی بڑھی ہوئی کیفیت سے انسان پر جذباتی آسودگی' جذباتی آزادی اور جذباتی کیف وانبساط کی راہیں بالکل بند ہو جاتی ہیں۔ تشویش کی خاصیت ہی یہ ہے کہ فرد کو نہ اس کے منبع کا شعوری احساس ہوتا ہے نہ اس پر قابو پانے کی قدرت ہوتی ہے۔ یہ مجبوری اور بے بسی اس کیفیت کو مزید پیچیدہ بناتی ہے۔ ایسی صورت میں جھنجلاہٹ پیدا ہوتی ہے اور اس کے زیر اثر منفی جذبات مثلاً غصہ' چڑچڑا پن' مخاصمت اور عداوت وغیرہ کے جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں جو مزید پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ یہ مریضانہ منزل ہے اور اس کی طرف توجہ دینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ورنہ شدید صورتوں میں خلل دِماغ (Psychosis) کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس بیماری کی روک تھام کے لئے ضروری ہے کہ ہر عمر کے نارمل جذبات اور تقاضات کا اندازہ کر کے ان کی صحت مند نکاسی اور نشوونما کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔

اس سلسلے میں پروفیسر ساجدہ زیدی نے ایک اور خرابی کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ ہماری ذہنی نشوونما کا ایک بڑا وسیلہ ہمارا ادراک ہے اور ہمارے ادراک کی نوعیت کا بڑی حد تک تعین ہمارے شوق ودلچسپی اور ہمارے زاویہ نظر سے

ہوتا ہے۔ یعنی ہم تقریباً لاشعوری طور پر انہیں مدرکات کا انتخاب کرتے ہیں جن سے ہمیں لگاؤ پیدا ہو چکا ہوتا ہے اور جس کے بارے میں ہمارا شوق وتجسس زیادہ ہوتا ہے۔ انسان کے ذہن پر اگر کوئی فکر چھائی ہو، اگر اسے کسی سلسلے میں تشویش پیدا ہو چکی ہو، اور اس کا جذباتی آہنگ مجروح ہو چکا ہو تو وہ عموماً اپنی دلچسپی کی چیزوں کا بھی پورے طور پر ادراک نہیں کرسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذہن تشویش وفکرمندی کے احساسات میں الجھا رہتا ہے وہ پورے طور پر فعال نہیں ہوتا اور اس کی مشاہدہ وادراک کی صلاحیت تشویش وفکر کے پردوں کے پیچھے چھپ جاتی ہے۔ ایسی صورتوں میں خارجی اشیاء اور عوامل کا ادراک عموماً زیادہ مشکل ہو جاتا ہے''۔ پروفیسر ساجدہ نے یہاں پر ایک اہم اور دوررس نتائج کے حامل مسئلہ (Proposition) کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انسان اس کائنات، جو اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے، کی طرف مختلف قسم کی آرزوؤں کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک علم کی آرزو ہے۔ خداداد صلاحیتوں کی بنا پر حصولِ علم اور اس علم کی سطح پر انسانی شعور میں حقیقت کے اجزاء پہلوؤں کو سمجھنے کی طلب پائی جاتی ہے۔ فلسفیانہ سطح پر انسانی شعور کا مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ حقیقت من حیث الکل کا یعنی منتہائے حقیقت کا علم حاصل کرے۔ علم کی کوئی شاخ مثلاً علم سیاسیات، عمرانیات، علم معاشیات، علم طبعیات اور علم کیمیا وغیرہ ہو ان تمام علوم کا مبداء ادارک بالحواس (Percepts) اور عقل (Concepts) ہیں۔ اب اگر مشاہدہ یا ادراک ہی درست نہیں ہوگا تو لازمی طور پر تصورات بھی غلط ہوں گے اور نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ پورا علم ہی مشکوک ہو جائے گا جس کی وجہ سے تشویش اور غیر محفوظیت کے زیر اثر مریضانہ ذہنی کیفیت خارجی اشیاء خارجی عوامل اور حقائق کو ان کی صحیح نوعیت اور ان کے صحیح سیاق وسباق میں سمجھنے سے قاصر ہوگی۔ کیونکہ ان نفسیاتی مریضوں کا ذہنی ادراک مسخ شدہ صورتوں میں ہوتا ہے۔

ہمیں دِلوں کی ان بیماریوں یا ذہنی ونفسیاتی عوارض کا مشاہدہ کرنے کے لئے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے ہاں ڈر، خوف، تشویش، غیر محفوظیت اور دیگر خطرات کی وجہ سے پیدا ہونے والی تمام بیماریاں مثلاً جذباتی گھٹن، مریضانہ جذباتیت، ذہنی کشمکش، دماغی خلل، دماغی عارضے، غیر مہذب کرداری خلل، جنسی عوارض، منشیات کا بے دریغ استعمال، شخصیاتی خلل، خبط، اجبار جیسے کئی دوسرے نیوراتی یا عصباتی اور ذہنی اختلالی عوارض پورے ملک میں پائے جاتے ہیں۔ 19 اگست 2013ء کو دنیا میں یوم اِنسانیت (Humanitarian Day) منایا گیا۔ اس ضمن میں ''وائس آف امریکہ'' سے پاکستان کے بارے میں نشر ہونے والے ایک پروگرام میں بتایا گیا تھا کہ ملک میں جاری دہشت گردی، لوٹ مار، حکومتی سطح پر بددیانتی وناانصافی، زخیرہ اندوزی اور ہوشربا مہنگائی کے عفریت کی وجہ سے شہریوں کے ذہنی اختلال (Psychoses) میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ B.B.C کی ایک رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ ملک میں اغوا برائے تاوان کے کاروبار نے ایک منافع بخش انڈسٹری کی صورت حاصل کر لی ہے۔ یہ ایسے واضح حقائق ہیں جنہیں محض پراپگنڈا کہہ کر نظرانداز کر دینے سے مزید خرابی ہوگی۔

نیوراتی وذہنی امراض میں تشویش و بے جا خوف کے علاوہ چند بیماریاں اور بھی ہیں۔ ان میں ایک خبط (Obsession) کی بیماری ہے جس کا تعلق انسان کی سوچ وخیالات سے ہے۔ایک عام آدمی کے ذہن میں غیر ارادی طور پر خیالات آتے رہتے ہیں۔لیکن انسان کے ذہن میں اگر ایک ہی سوچ یا خیال بار بار آئے اور وہ چاہنے کے باوجود اس سوچ کو اپنے ذہن سے نہ نکال سکے تو ایسے شخص کو نفسیات کی سائنسی اصطلاح میں خبطی (Obsessional) شخص کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات وارد ہونے والے خیالات ڈراونے بھی ہوسکتے ہیں اور بعض اوقات بالکل لغو اور بے سروپا بھی۔ بروقت مناسب علاج نہ ہونے کی صورت میں یہ مرض اس قدر شدت اختیار کر جاتا ہے کہ اس مرض کا شکار دوسرا کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ ایک اور نیوراتی مرض جس کا تعلق انسانی کردار سے ہے جسے نفسیاتی اصطلاح میں اجبار (Compulsion) کا نام دیا گیا ہے۔اس میں مبتلا شخص کوئی ایک حرکت یا ایک سے زائد حرکات بار بار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔مثلاً بار بار صابن سے ہاتھوں کو دھونا' بجلی کے بٹن کو بار بار اوپر نیچے کرنا۔ بار بار پاؤں دھونا' کپڑوں کو بار بار استری کرنا اور کھانے کے برتنوں کو بار بار دھونا وغیرہ وغیرہ۔ وہ شعوری طور پر جانتا بھی ہے کہ اس کے یہ اعمال بے معنی اور لغو ہیں لیکن وہ انہیں چھوڑ نہیں سکتا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ عمل کوئی بیرونی یا انجانی قوت اس سے سرانجام دلوا رہی ہے۔ایک اور مرض اختناق (Hysteria) ہے۔اس بیماری کی بہت سی مختلف علامات ہیں' I.C.D-9' کے تحت اختناق کی تمام مختلف علامات کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے گروہ میں شامل علامات کو افتراقی ردِعمل (Dissociative reaction) کا نام دیا گیا ہے جس میں حافظہ کھونا (Amnesia) نسیان گردی (Fugue) اور کثیر تعداد شخصیت جیسے امراض شامل ہیں۔ اور دوسرے گروہ میں شامل علامات کو تحویلی اختناق (Conversion hysteria) کا نام دیا گیا ہے۔اس میں ضعفِ اعصاب (Neuras Thenia) سودا (Hypochondria) نیوراتی اضمحلال (Neuratic Depression) اعدام شخصیت (Depersonalization Syndrome) اور دیگر ذہنی اعمال (Other Neurotic Disorders) شامل ہیں۔ان کے علاوہ ذہنی اختلال (Psychosis) کے امراض بھی ہیں جن میں انشقاق ذہنی (Schizophrenia) کی آٹھ قسمیں' تحسیسی اختلال ذہنی کی چار اقسام اور دیگر کئی امراض شامل ہیں۔

نفسیاتی بیماریوں کی کئی اور اقسام بھی ہیں جن کا آگے مناسب موقعہ پر تذکرہ ہوتا رہے گا۔ یہاں پر مناسب ہے کہ ان کتابوں کا ذِکر کر دیا جائے جن سے نفسیات کے بارے میں زیادہ تر مواد لیا گیا ہے۔ان میں ایک کتاب ''نفسیات'' کے نام سے ہے جسے چار ماہرین نفسیات حمیر ہاشمی' ناصرہ فاروق' رفیق جعفر اور عبدالحمید نے مرتب کیا ہے اور اردو سائنس بورڈ لاہور نے شائع کیا ہے۔تقریباً ساڑھے گیارہ سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کے مرتبین کا دعویٰ ہے کہ اس کتاب میں نفسیات سے متعلق تمام موضوعات کے علاوہ نیا اور تجرباتی مواد' نیز نفسیات کے جدید رجحانات اور موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔نفسیات پر ایک بہت ہی اہم اور مفید کتاب پروفیسر ساجدہ زیدی کی ''انسانی شخصیت کے اسرار و رموز'' ہے۔آپ پروفیسر' نفسیات اور

تخلیقات کی ایکسپرٹ ہیں اور علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم سے صدر شعبہ کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہوئی تھیں۔ اس کتاب میں ''نفسیاتی عمق کے آئینے میں انسانی شخصیت کی پردہ کشائی کی گئی ہے۔ اس ضمن میں فرائیڈ، ژنگ اور نوفرائڈی ماہرین نفسیات کے نظریات کی تعبیر اور تنقیدی تجزیئے کی روشنی میں انسانی عمل، جذبہ اور محرکات اور انسانی شعور، لاشعور اور اجتماعی لاشعور کی پر اسرار دنیا سے پردہ اٹھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے''۔ ایک اور کتاب ''تعلیمی نفسیات'' کے نام سے ہے جس کے مؤلف ڈاکٹر محمد عالم ضیاء ہیں اور ملک محمد موسیٰ اور شازیہ رشید کی تالیف کردہ کتاب ''تعلیمی نفسیات'' بھی میرے سامنے ہے۔ اور ایک اہم کتاب ''فرائیڈ کی نفسیات'' از شہزاد احمد۔

نفسیات اور اخلاقی اقدار یا عقائد (کسی قسم کے بھی ہوں) کا بھی آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ اقدار مطلق ہونے چاہئیں یا اضافی اور ان کا سرچشمہ موضوعی یعنی خود انسان ہے یا معروضی یعنی انسان کو یہ اقدار کہیں خارج سے ملتے ہیں؟ ان موضوعات پر فلاسفہ، سائنسدانوں، ماہرین حیاتیات اور نفسیات میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایک جماعت کا کہنا ہے کہ انسان ایسا وجود ہے جو صاحب اختیار ہے اس لئے وہ صداقت و اخلاقی اقدار کا خود موجد ہے۔ اقدار کے لئے اسے کہیں باہر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے نزدیک معروضی اندازِ فکر انسانی شخصیت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ حق وہی ہے جو موضوع کے لئے حق ہے۔ ایسا نظریہ رکھنے والوں کا زیادہ تر تعلق موجودیت پسندی (Existentialism) کے نظام فکر سے ہے۔ اکثر ماہرین اور فلسفی اسے ''وجودیت'' کہتے ہیں جو علی عباس جلالپوری کے نزدیک غلط ہے وہ کہتے ہیں کہ وجود 'Being' کا ترجمہ ہے Existence کا ترجمہ ''موجود'' ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے ہاں وجودیت سے مراد وحدت الوجود یا ہمہ اوست ہے۔ اس مکتبہ فکر کے اکثر ترجمان قنوطیت پسندی کا شکار تھے۔

کیرک گرد کو موجودیت کا بانی سمجھا جاتا ہے لیکن اس کے بعض افکار کی پیش قیاسی پاسکل (م 1662ء) نے کی تھی۔ وہ مریضانہ حساسیت، آشفتہ سری اور یاسیت کے باعث خود زندگی سے ہی تنگ تھا۔ اس کا اپنی منگیتر سے جھگڑا ہو گیا تو لڑکی نے کہا مجھے تم پر رحم آتا ہے۔ کیرک نے کہا ''ایک شریف اور غیور آدمی سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن ایک بات ناقابل برداشت ہے۔ اور وہ ہے رحم''۔ وہ دہشت (The concept of dread) کا نفسیاتی اور مذہبیاتی تجزیہ کرتے ہوئے دہشت اور خوف میں فرق کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خوف تو کسی نہ کسی شئے یا فرد کا ہوتا ہے اور دہشت کا تعلق انسان کے آزادی عمل کی پیداوار ہے۔ جب انسان آزادانہ عمل کرنے کا تہیہ کر لیتا ہے وہ دہشت کا شکار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہر گناہ کے ارتکاب سے قبل دہشت لازماً موجود ہوتی ہے۔ کیرک بھی معروضیت کے مقابلے میں موضوعیت کو حق و صداقت سمجھتا ہے۔ ''ایک موجود متنفس صرف اپنی موجودگی کا ہی علم حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ موضوع اسی موضوعیت ہی میں کھو جائے، وہ واضح اعلان کرتا ہے کہ ''میرا انتخاب اور فیصلہ شخصی ہے کوئی ذات مطلق میرے لئے کسی قسم کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار و ارادہ دیا ہوا ہے لیکن یہ کہنا تو مبالغہ آرائی کے زُمرے میں آتا ہے کہ ''موضوع ہی حقیقت ہے اور حقیقت

ہمیشہ موضوع ہی میں ہوتی ہے''۔ کیرک کا خدا اپنے وجود کے لئے انسانی موضوع یا موجودگی کا محتاج ہے۔

سورین کیرک گرد کے نزدیک سائنس جو معروضی استدلال سے کام لیتی ہے غلط ہے کیونکہ صرف موضوعی اندازِ فکر سے انسانی مسائل اور عقدوں کو حل کیا جا سکتا ہے۔ اس نے زندگی کو کھوکھلی اور لغو قرار دے کر ستر سال زندہ رہ کر انتظار کرنے کے بجائے مشورہ دیا ہے کہ ''کیوں نہ اس زندگی کا فوری طور پر خاتمہ کر دیا جائے''۔ زندگی کے بارے میں اس نوع کی تحریروں سے بعض ماہر نفسیات نے اسے ''پژمردگی کے جنون''(Affective Psychosis) کا مریض قرار دیا ہے۔

جبریل مارسل ہائی ڈگر اور ژاں پال سارتر بھی کیرک کے مقلدین میں سے ہیں۔ سارتر 1905ء میں فرانس میں پیدا ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کو وہ بھی لغو اور بے معنی سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک ''اپنے آپ کو معنویت عطا کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ عدم سے کامل آزادی کا اقدام کیا جائے۔ چنانچہ انسان کی آزادی اس کے ذات کے عدم سے ہی معرضِ وجود میں آتی ہے''۔ اس کے خیال میں عدم ہی وجودِ مطلق ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ ''میں وہ ہوں جو نہیں ہوں اور میں نہیں ہوں جو ہوں''۔ اس طرح سارتر کی مابعد الطبعیات میں منفی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ انسان پسندی (Humanism) کو سب سے بڑی قدر سمجھتا ہے۔ اسی انسان دوستی کو سامنے رکھ کر وہ کہتا ہے یہی ہمارا ہیومنزم ہے جس سے ہم انسان کو یاد دلاتے ہیں کہ سوائے انسان کے کوئی اس کے لئے قانون نہیں بنا سکتا''۔ نیز یہ کہ ''ہم نے خدا کے وجود سے انکار کر دیا ہے تا کہ انسان خود انسان کے لئے وجودِ مطلق بن جائے''۔ سارتر کی یہ بات بڑی اہم اور دور رس نتائج کی حامل ہے حقیقت میں انسان خدا' وحی اور انبیاءؑ کا انکار کرتا ہی اس لئے ہے کہ اسے اپنے سے کمزور اور بے بس انسانوں پر ظلم و ستم توڑنے کی کھلی چھٹی مل جائے۔ اس میں انسانی نفسیات کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ سارتر نے کہا ''میری آزادی یہ معلوم کر کے آزادی سے دوچار ہوتی ہے کہ یہ قدروں کی ایسی بنیاد ہے جس کی اپنی کوئی بنیاد نہیں ہے''۔ اس پر علی عباس یوں تنقید کرتے ہیں۔ ''یہ بات موجب حیرت ہے کہ آزادی کا وہ تصور جس کی اپنی کوئی بنیاد نہ ہو قدروں کی بنیاد کیسے بن سکتا ہے''۔

ان فلاسفہ سے پہلے والٹیئر' لامتری' دیورو اور ہولباخ وغیرہ نے عقل و خرد اور سائنس پر کامل اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے یہ استدلال پیش کیا تھا کہ چونکہ عقل انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتی ہے اس لئے تنہا عقل ہی تہذیب و تمدن کی اساس ہے۔ بات کسی حد تک درست ہے لیکن خود تعقل (Mental Process) ابھی تک اِرتقائی منازل میں ہے اس لئے یہ حق و باطل' خیر و شر اور غلط یا صحیح کا معیار نہیں بن سکتا۔ ارادیت پسندی کا مشہور شارح فریڈرک نطشے 1844ء بھی یہی کہتا ہے کہ ''صداقت اٹل امر نہیں بلکہ اضافی اور تغیر پذیر ہے''۔

خیر و شر کا معیار یہ ہے کہ ''جو کچھ بھی قوت سے ظاہر ہو وہ خیر ہے اور جو کمزوری سے ظاہر ہو وہ شر ہے''۔ وہ اپنی ایک تصنیف ''بقولِ زردشت'' میں کہتا ہے۔ ''خدا مر چکا (نعوذ باللہ) ایسا فوق الانسان خدا تیرا سب سے بڑا خطرہ تھا۔ وہ قبر میں گیا تم اُٹھ بیٹھے''۔ دوسرے رومانیوں یا ارادیت پسندوں کی طرح نطشے کا اساسی خیال بھی یہی ہے کہ ''جذبات ہمارے لئے نصب

العین معین کرتے ہیں اور عقل ان کے حصول کے لئے وسائل فراہم کرتی ہے''۔ خود ہماری درس گاہوں میں بھی اقدار کو جذبات اور رویوں کی حیثیت سے متعارف کرایا جاتا ہے۔ (تعلیمی نفسیات صفحہ 89)

جذبات پر بحث آگے آئے گی۔ اقدار کے سرچشمے کے بارے میں سوفسطایہ کا بھی یہی نظریہ تھا کہ ان کو انسان خود متعین کرتا ہے۔ یہ ایک مختصر سا جائزہ اس مکتبہ فکر کا ہے۔ جو انسانی تہذیب وتمدن یا انسانی ذات کی نشوونما کے لئے کسی قسم کی بھی خارجی راہنمائی کو ضروری نہیں سمجھتے وہ قطعی طور پر اس کے منکر ہیں۔ ان کے برعکس ان فلاسفہ، سائنسدانوں یا دانشوروں کا ایک مکتبہ فکر ہے جو انسان کی راہنمائی کے لئے خارج سے ہدایت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے ذِکر سے پہلے مناسب ہے کہ قرآن پاک کا مؤقف بھی میں اپنی سمجھ اور استعداد کے مطابق بیان کردوں۔

حضرت علامہ اقبالؒ کے نزدیک قدیم یونانی فلاسفہ کا طریق کار قیاسی (Deductive) تھا۔ یہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک ہے جن پر زندگی کے علم وحکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رُخ کے عین مطابق تھے۔ لہٰذا علامہؒ کے نزدیک اسلام کا ظہور عقل استقرائی اور تجرباتی (Inductive and Experemental) کا ظہور ہے۔ عقل کے تجرباتی طریق کے بارے میں علامہ پرویز لکھتے ہیں۔

> ''نزول قرآن کے بعد عقل کے اس تجرباتی طریق 41:53 کے ساتھ ایک اور عنصر بھی شامل ہوجاتا ہے، وسائلِ نشرواشاعت کی ہمہ گیریت کی وجہ سے قرآنی حقائق بھی فضائے عالم میں عام ہو چکے اور ہوتے جارہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسانی فکر، شعوری یا غیر شعوری طور پر ان سے متأثر بھی ہورہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عقل اپنے تجربات سے پہلے، جس مقام تک صدیوں میں جاکر پہنچتی تھی اب وہ نسبتاً قلیل ترین عرصہ میں پہنچ جاتی ہے۔ لہٰذا (جیسا کہ میں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر مشتمل اپنی تصنیف ''معراج انسانیت'' میں لکھا ہے) علیٰ رؤس الاشہاد کہا جاسکتا ہے کہ بزم ہستی میں جہاں کوئی روشنی کی کرن نظر آتی ہے وہ اسی آفتابِ جہاں تاب کی ضیا باریوں کا تصدق، اور گلشنِ عالم میں جہاں کوئی پھول مہکتا دکھائی دیتا ہے وہ اسی جانِ بہار کی نکہت بیزیوں کا رہین منت ہے۔ ؎
>
> ہر کجا بینی جہانِ رنگ وبو
> آنکہ از خاکش بروید آرزو
> یاز نورِ مصطفیؐ اور ابہاست
> یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیؐ است

اقدار اور احکامات کے بارے میں قرآنِ کریم میں بنیادی اصول یہ دیا گیا ہے کہ ''اللہ کے سوا کوئی بھی صاحبِ اقتدار نہیں اس لئے اسی کی طرف سے دیئے گئے احکامات اور اقدار کی محکومیت اختیار کی جائے۔'' ''ہم نے تمہاری طرف یہ ضابطہ

قوانین نازل کیا ہے جس میں خود تمہارے شرف وعظمت کا راز پوشیدہ ہے اگر تم ذرا عقل وبصیرت سے کام لے کر اس کو سمجھنے کی کوشش کرو تو تم پر واضح ہو جائے گا کہ اس پر عمل، اس کی پیروی کرنے سے تمہیں بلندیاں اور سرفرازیاں حاصل ہوں گی۔ اور اگر اس کے بتائے ہوئے احکامات کی خلاف ورزی کی تو تم بھی اسی طرح تباہ وبرباد ہو جاؤ گے، جس طرح ہم نے تم سے پہلے کتنی ہی قوموں کو برباد کر دیا 21:10-11''۔

ہر طرف سے کٹ کر اسی کے احکامات اور قوانین کی پیروی کرو۔ اس کی اتباع اور اطاعت میں کسی اور کے قوانین وفیصلے شامل نہ کرو یعنی شرک نہ کرو، 30:31''۔

''تمام اختلافی امور کے فیصلے احکامات الٰہی کے مطابق کرو 4:105''۔ ''نوع انسانی کے لئے ضابطہ خداوندی سے بہتر اور کوئی ضابطہ قوانین نہیں 5:50''۔

''خدا کا قانون اس قدر بلند اور عظیم المرتبت ہے کہ کوئی اور قانون اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا 31:30''۔

جو لوگ قوانین خداوندی کا اتباع کرتے ہیں وہ ہر قسم کی تخریب سے محفوظ بھی رہتے ہیں اور انہیں ان کی محنت کے بھرپور نتائج بھی ملتے ہیں۔ یہ قانون سرتاپا حقیقت وصداقت پر مبنی ہے قرآن پاک میں وہ سب کچھ آ گیا ہے جو انسانوں کی راہنمائی کے لئے ضروری ہے 35:30-32''۔ وہ الصلوٰۃ کو قائم (Establish) کرتے ہیں اور جو کچھ انہیں قوانین خداوندی کے تحت حاصل ہوتا ہے اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے کھلا رکھتے ہیں 2:3۔ یعنی صلاۃ اور معاشیات میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اسلام کے مطابق جہاں بھی مسلمان اقتدار میں ہوں وہاں انسانی معاملات سے متعلقہ اور غیر متعلقہ تمام شعبے قرآنی اصول واحکامات کے مطابق ہونے لازمی ہیں 22:41، 24:55۔ اسی لئے اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا تذکرہ زیادہ تر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔ اجتماعی معاملات میں باہمی مشاورت کا حکم بھی اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ منسلک ہے۔ 42:38۔

الصلوٰۃ اور معاشیات کے باہمی تعلق کو حضرت شعیبؑ کے تذکرے میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے جہاں منکرین ان کی نماز پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''اے شعیبؑ! یہ تمہاری صلوٰۃ کس قسم کی ہے جو یہ کہتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اور یہ کہ ہم اپنے مال ودولت کو بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہ کریں۔ بڑی عجیب نماز ہے'' 11:87۔

(جاری ہے)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب المراسلات

سوال بیرونِ مُلک تعلیم حاصل کرنے والے ایک طالب علم نے سوال پوچھا ہے کہ جب کبھی بھی دین کی بات ہوتی ہے تو اکثر اُس سے سوال کیا جاتا ہے کہ:

علم کی حقیقت (الحق) جاننے کے لئے انسان کو عقل ودیعت کیا گیا ہے تو اللہ نے پھر ہمارے لئے Divine بمعنی الہیاتی وحی کے علم سے بھی راہنمائی حاصل کرنے کی دین میں ضرورت کیوں لازم سمجھی ہے؟

جواب حقیقت کی تلاش کے لئے باقاعدہ عقلی روش میں فلسفہ کے علم کی رو سے علم وخِرد کے ذریعہ سے الحق کے فہم کا دائرہ مختصر اور محدود ہے۔ اس کے لئے عصرِ حاضر میں عام طور پر انسانی عقل پر انحصار کیا جاتا ہے، جس سے پورے حق یعنی الحق کی تلاش ہو نہیں پا رہی۔ الحق کے علم کی اہمیت کے اندازہ کا آغاز قرآن کی روشنی میں الحق کے مفہوم کو سمجھ کر بھی لگایا جا سکتا ہے۔

الحق کا مفہوم:

حق کے لغوی اور اصطلاحی معانی ہیں کسی چیز کا اس طرح موجود ہو جانا، واقع ہو جانا اور ثابت ہو جانا کہ اس کے واقع ہونے پر اس کے وجود سے انکار نہ کیا جا سکے۔ کسی شے کا موجود ہونا اسی وقت ثابت ہوگا، جب شے کا ہمارے حواس احاطہ کر لیں، یعنی شے ٹھوس شکل اختیار کر لے۔ چنانچہ تحقیق کے معنی ہیں کپڑے کو نہایت مضبوطی کے ساتھ تعمیری انداز میں بننا۔ نیز ہر اُس موجود چیز کو حق کہتے ہیں، جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق ہو۔

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ (4:157)

وہ (حقیقی) علم نہیں رکھتے بلکہ ظنّ کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔

صِرف عقل سے لئے گئے نتیجہ میں حتمی طور پر الحق کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ راغب نے اِس ضِمن میں وضاحت کی ہے کہ جب کسی حقیقت کے متعلق پورا یقین نہ ہو تو اُس کے دو پہلو ہوتے ہیں۔

① انسان کبھی حقیقت کی طرف مائل ہوتا ہے اور

② کبھی اس سے دور ہٹ جاتا ہے۔

اس لحاظ سے اس علم کے دونوں پہلوؤں کو ظنّ کہتے ہیں۔

ایسے ظن کی شکل لئے ہوا علم حقیقت کے فہم میں معاون ثابت نہیں ہوتا۔

اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغۡنِیۡ مِنَ الۡحَقِّ شَیۡئًا ؕ (10:36)

ظن، حق کے مقابلہ میں کچھ کام نہیں دیتا۔

اس لئے اتباع، حق کی کرنی چاہیے ظن کی نہیں۔ دین یکسر حق ہے اس میں ظن کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ دوسرے مقام پر اللہ نے خود وحی کے ذریعے علم کو الحق کہہ کر پکارا ہے۔

اللّٰہِ مَوۡلٰىہُمُ الۡحَقِّ (10:30)

اللہ خود اپنے قوانین کے ذریعے حق ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا کہ:

اَنَّ الرَّسُوۡلَ حَقٌّ (3:86)

اس کا رسول حق ہے۔

دیگر جگہ پہ ہے کہ:

اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ہُوَ الۡحَقُّ ۙ (34:6)

اس کی طرف سے بھیجا ہوا قرآن حق ہے۔

سورہ یونس میں ہے کہ:

اَلَاۤ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ (10:55)

اللہ کے وعدے (قوانین) حق ہیں۔

دین اسلام کے بارے میں کہا کہ:

دِیۡنِ الۡحَقِّ (9:33)

اس کا دین حق ہے۔

کائنات کے بارے میں کہا کہ:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ (64:3)

یہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے۔

چونکہ حق، ظن وشکوک سے بلند ہوتا ہے اور وہ ایک ٹھوس تعمیری واقعہ کی شکل میں سامنے موجود ہوتا ہے، اس لئے ظہور نتائج کو بھی اَلْحَآقَّۃ (69:1) کہا گیا ہے۔

حق کوئی ذہنی، نظری، تصوراتی یا محض عقیدے کی چیز نہیں ہے۔ اس دنیا سے متعلق کوئی عقیدہ حق نہیں کہلا سکتا، جب تک اس کے تعمیری نتائج ایک ٹھوس حقیقت بن کر سامنے نہ آجائیں۔

جیسا کہ بتایا گیا ہے حق کوئی ذہنی، نظری، تصوراتی یا محض عقیدہ کی چیز نہیں۔ یہ عقائد اور نظریات کے تعمیری نتائج کا نام ہے، جو ٹھوس شکل میں سامنے آجائیں اور اپنی صداقتوں کے لئے خارجی دلائل کے محتاج نہ ہوں۔ اِس دنیا سے متعلق کوئی عقیدہ حق ثابت نہیں کہلا سکتا، جب تک اِس کے تعمیری نتائج ایک ٹھوس حقیقت بن کر سامنے نہ آجائیں۔ اِس کے بالمقابل فرد کا صِرف عقل سے حاصل کیا ہوا علم باطل اور ظنّ کہلاتا ہے اور اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا جاتے رہنا ہوتے ہیں۔ جب کسی چیز کو کسوٹی پر پرکھا جائے، اور وہ اُس پر پوری نہ اُترے تو اُسے باطل کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے کہ:

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (17:81)

حق آ گیا ہے اور باطل تباہ ہو گیا۔ باطل ہوتا ہی تباہ ہونے والا ہے۔

باطل کہتے ہی اُسے ہیں، جو باقی رہنے والا نہ ہو۔ وہ اُس وقت تک باقی رہتا ہے، جب تک میدان میں حق نہیں آتا۔

آپ نے صحیح فرمایا ہے کہ الحق کے علم کی تلاش میں ہمیں عقل کی قوت ودیعت کی گئی ہے، لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ کافی ہے؟

اِس کا جواب تو نوعِ انسانی ابھی تک ڈھونڈ رہی ہے اور ڈھونڈتی رہے گی لیکن قرآن عقل کے علاوہ حقیقت کے سمجھنے کے لئے اِس میں اللہ کی طرف سے قیامت تک کے لئے قرآن میں محفوظ اللہ کے کلام سے استفادہ کرنے کو بھی لازم قرار دیتا ہے۔ اس کی ضرورت محسوس ہونے کی مُختصر سی تفصیل یوں بیان کی جاسکتی ہے۔

عقل محض کا دائرہ:

سب سے پہلے ہمیں اس بات کو متعین کرنا پڑے گا کہ الحق کے نظریہ کی بنیاد کیا ہے؟ وہ کیا معیار ہے جس کے مطلوبہ نتائج سامنے آنے پر اُس نظریہ کو حق کا درجہ دیا جائے۔؟

نوع انسانی بھی اپنی عقل وفہم سے قرآن کے متعین کردہ معیار کے فِکری طور پر قریب آتی نظر آرہی ہے کہ الحق اجتماعی مفاد میں مُضمِر ہے۔

قرآن نے اِس کی طرف ہماری راہنمائی کرتے ہوئے اس امر کے مُطلق معیار کی طرف بقاءوارتقاء کے نتائج کے حامل کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا کہ:

وَاَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ؕ (13:17)

دنیامیں بقاءاس عمل کے لیے ہے جوتمام نوع انسان کے لیے نفع بخش ہو۔

1۔جو چیز (نظام یانظریہ) انفرادی جبلی تقاضوں کے تحت گروہ بندانہ مفاد پر مبنی ہوتی ہے وہ مٹ جاتی ہے اور

2۔جس نظام کا مطمحِ نگاہ نوع انسانی کی منفعت ہوتا ہے، وہ باقی رہ جاتا ہے۔

3۔کائنات کا ثبات اور بقاء کے لئے یہی اصول کلّی ہے، جوانفرادی مفادخویش کی بجائے، کلی انسانیت کے مفاد کا حامل وہ محور ہے جس کی تلاش کرنے ہی میں انسانی علم کی بنیاد استوار کی گئی ہے۔

اس ضمن میں برگسان کہتا ہے کہ عقل تنہا اقدار کا حقیقی علم دینے میں ناکام رہتی ہے۔

انسان تنہا عقل کی روشنی میں صرف اور صرف اپنا ذاتی مفاد دیکھتا ہے اور صحیح راہ پر چل ہی نہیں سکتا۔ جب بھی اجتماعی مفاد کی بات ہوگی تو عقل اسے کسی دوسرے راستہ پر ڈال دے گی۔ عقل اپنے ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ جب ہم اسے اس مقصد سے بلند مقاصد کی طرف لے جانا چاہتے ہیں تو وہ اس بلند سطح کے متعلق ممکنات کا سراغ دے سکے تو شاید ورنہ وہ حقیقت کا پتہ تو کسی صورت میں دریافت ہی نہیں کرسکتی۔

عصرِ حاضر میں اس مقصد کی جانب انسانی فکر کا سفر جاری وساری ہے لیکن عقل کا طریقہ تجرباتی ہوتا ہے۔ عقلی طریق یہ ہے کہ انسان ایک چیز کو اختیار کرتا ہے۔ اس پر مدتوں محنت کرتا ہے اور آخرالامر دیکھتا ہے کہ اس کا تجربہ ناکام رہا۔ وہ اسے چھوڑ دیتا ہے اور کوئی دوسری راہ اختیار کرتا ہے اور ایک مدت تک اس راہ پر چلتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ ناکام تجربوں اور خونریز لڑائیوں کے بعد وہ آخرالامر صحیح راستہ کے قریب جا پہنچتا ہے اور جب وہ اس راستہ پر پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ یہ وہی راہ تھی جس کی طرف خدا نے (وحی کے ذریعہ) رہنمائی کی تھی۔ اِس طرح وحی کی راہنمائی کے حصول کی تعریف میں علامہ اقبال نے اپنے مشہورِ زمانہ لیکچر میں فرمایا کہ:

It economises the human efforts.

اس کے علاوہ افلاطون کے الفاظ میں:

یہ (ارباب فکر) کچھ بنائیں گے۔ اسے پھر مٹائیں گے۔ یہی کچھ کرتے رہیں گے تا آنکہ وہ انسانی راستوں کو حتی الامکان، خدا کے راستوں سے ہم آہنگ کرلیں۔

اس کی وضاحت میں آئن سٹائن لکھتا ہے کہ:

سائنس (علم استدلالی) صرف یہ بتاسکتی ہے کہ ''کیا ہے'' وہ یہ نہیں بتاسکتی کہ ''کیا ہونا چاہیے'' اس لیے اقدار متعین کرنا اس کے دائرہ سے باہر ہے۔ اس کے برعکس مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ انسانی فکر وعمل کے لیے معیار مقرر کرے..... سائنس نہ تو اقدار متعین کرسکتی ہے اور نہ ہی انھیں انسانی سینے کے اندر داخل کرسکتی ہے۔ سائنس زیادہ سے زیادہ ایسے ذرائع فراہم کرسکتی ہے جن سے انسان مطلوبہ مقصد حاصل کرسکے۔

ذرائع علم:

عقل کے تناظر میں نظریہِ علم کے مُختلف زاویوں سے جانچ و پرکھ کرنے کے ماہرین کے ذرائع علم کے نکتہ نگاہ کا مُلخص یہ ہے کہ:

1۔ نظریہ تجربیت کا خیال ہے کہ ہمارے مشاہدات وتجربات ہی علم کا واحد ذریعہ ہیں لیکن

2۔ دوسرا نظریہ تصوریت کا گروہ کہتا ہے کہ علم کا ذریعہ استدلالی ہے جس سے مفہوم یہ ہے کہ ہمیں بعض اصولوں کو بطور مسلمات تسلیم کرنا پڑتا ہے اور پھر ان مسلمات کی روشنی میں، حواس کے ذریعہ حاصل شدہ معلومات سے نتائج اخذ کرنے ہوتے ہیں۔ جب تک ان مسلمات کو بطور معتقدات نہ مانا جائے سائنس کا علم آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔

دوسرے نظریہ تصوریت کے گروہ میں ایک گروہ:

3۔ ان مسلمات کو منطق کی رو سے ثابت کرتا ہے لیکن

4۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ مسلمات ریاضی کی دنیا سے متعلق ہیں جنہیں انسانی نفس نے بغیر دلیل صحیح تسلیم کر رکھا ہے اور چونکہ تمام کائنات ان اصولوں پر پوری اترتی چلی جارہی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نفس انسانی اور کائنات کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔

یہ سب کچھ مشہود کائنات کے متعلق ہے۔ باقی رہی غیب کی دنیا، اسکے متعلق سائنس کے پاس کوئی ذریعہ علم نہیں۔ ساری بحث کا مُلخّص یہ ہوا کہ:

5۔ غیب کی دنیا کے متعلق سائنس کے پاس کوئی ذریعہ معلومات نہیں اور

6۔ مشہود دنیا کے متعلق بھی جب تک ایسے مسلمات بطور اصول تسلیم نہ کیے جائیں جو تجربہ اور مشاہدہ کی پیداوار نہیں ہیں، یقینی معلومات حاصل کی ہی نہیں جاسکتیں۔ اِنہی وجوہات کی بِنا پر راشڈل کی نظر میں حق کا مستقل اور مطلق معیار کا علم حاصل ہی نہیں ہوسکتا جب تک انسان بطور مسلمہ خدا کے وجود پر ایمان نہ لائے۔

مطلق معیار کے معنی یہ ہیں کہ زمانے کے تغیرات اور احوال وظروف کے تبدّلات اس پر کسی صورت سے بھی اثر انداز نہ ہوں۔ وہ زمان ومکان کی حدود سے بالا ہو اور اس کا معیار خود اس کی اپنی ذات ہو۔ اس قسم کی اقدار ذہن انسانی (محدود ہونے کی بنا پر) کی پیداوار نہیں ہوسکتیں خواہ وہ ذہن تمام حکمائے مغرب ہی کا کیوں نہ ہو۔

کانٹ نے بھی خیر کے معیار میں عقل نظری (عقلِ محض) پر انحصار کرنے کی بجائے عقل عملی کا سہارا لیتے ہوئے اسے بطور مسلمہ کے تناظر میں خدا کے وجود سے مشروط کر دیا ہے۔ اِنہی دلائل کی بِنا پر وحی کی ضرورت لاینفِک ہوجاتی ہے۔

وحی بطور ذریعہ علم کی اہمیت:

قرآن کے مطالعے کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ:

اگر جذبات اور عقل کو وحی خداوندی (جواب مکمل شکل میں قرآن میں آخری پیغام کے طور پر محفوظ ہے) کی روشنی میں استعمال کیا جائے تو انسان اپنے حقیقی مقصد یعنی ذات کی نشوونما کی حقیقت تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ اسے مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ:

1۔ عقل انسانی کی قیمت ایک ''قوت'' ہے جس طرح اس قوت کا استعمال کیا جائے، اسی نسبت سے اس کے نتائج مرتب ہوں گے۔

2۔ جب عقل انسانی (جذبات سے الگ ہوکر) خارجی کائنات کے رموز واسرار کی تحقیق وتفتیش کرتی ہے تو وہ اپنے تجرباتی طریق سے صحیح نتیجہ تک پہنچ جاتی ہے۔

3۔ لیکن انسان کے باہمی معاملات میں یہ عقل جب جذبات کے تابع چلتی ہے یعنی جب اس قوت کو انسان کے جذبات استعمال کرنے لگ جاتے ہیں تو دنیا میں عقول کی جنگ شروع ہوجاتی ہے۔ جس کا نتیجہ فساد فی الارض کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

4۔ جذبات، انسانی عمل کے محرک ہوتے ہیں، اس لیے یہ بھی انسان کی بڑی متاع اور عظیم قوت ہیں، لیکن یہ قوت اس صورت میں تعمیری نتائج پیدا کرسکتی ہے جب اسے عقل پر غالب نہ آنے دیا جائے۔

5۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ عقل کو ان مستقل اقدار کا محافظ بنا دیا جائے جو انسان کو وحی کی رو سے ملتی ہیں۔ جب انسان جذبات سے الگ ہوکر علم وبصیرت کی رو سے غور وفکر کرے تو ان اقدار کی اہمیت ابھر کر سامنے آجاتی ہے اور یوں اس کی عقل ان کی حفاظت اور نگہداشت کو اپنا فریضہ قرار دیتی ہے۔

لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح اندھیرے میں دیکھنے کے لئے آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے، اِسی طرح حقیقت کو دیکھنے کے لئے انسانی عقل کو وحی کی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔

عقل انسانی کا اس طرح وحی کی روشنی میں فہم حاصل کر کے مستقل اقدار کی اہمیت کا قائل ہو جانا، ایمان کہلاتا ہے۔

6۔ یوں انسان کے جذبات اور اس کی عقل (دونوں عظیم قوتیں) ایمان کے معین کردہ نصب العین کے حصول کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور اس طرح فطرت کے قوانین انسانیت کی تباہی کی بجائے ان کی تعمیر اور تہذیب کا موجب بنتے چلے جاتے ہیں۔

اِن وجوہات کی بِنا پر Divine Directions الٰہیاتی ہدایات الحق کو قرآن نے بطور انسانی بنیادی حق کا درجہ دیا ہے۔ اسی لیے اس فریضہ کی ادائیگی کو بطور اللہ کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔

1۔ قرآن کا بطور فریضہ الحق کے لوگوں کے سامنے پیش کرنا۔

قرآن میں اللہ کی ذمہ داریاں بتاتے ہوئے اِس امر کی بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی ۝ (87:2-3)

خدا وہ ہے، جو ہر شے کی تخلیق کا آغاز کرتا ہے۔ پھر اُسے بنا سنوار کر، اس میں اعتدال پیدا کرتا ہے۔ پھر اِس کے لئے ایک قدر (اندازہ) مقرر کرتا ہے، اور ہدایت دیتا ہے (تا کہ شے قدر کے مطابق تکمیلی مراحل طے کر لے)۔

یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ حق کی طرف ہدایت کا تعلق اور ذمہ خود خدا نے اپنے اوپر لے رکھا ہے۔ قرآن میں ہے کہ:

اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی (92:12)

یقیناً ہدایت دینا ہمارے ذمہ ہے۔

اس سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ انسان کے بنیادی حقوق میں شامل ہے کہ اس کے سامنے حق پیش کیا جائے تا کہ وہ اس کی آگاہی کے بعد اس پہ ایمان لانے یا نہ لانے کا اپنے اختیار سے انتخاب کر سکے۔ اس ضمن میں یہ جاننا ضروری ہے کہ کائنات کی ہر شے میں یہ ہدایت (راہنمائی) ہر شے کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں جہاں ہدایت ودیعت کی جائے تو وہ چیز اس ودیعت کردہ ہدایت کی پابند ہو جاتی ہے اور اِس لئے وہ اس کے مطابق چلنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اس کے بر عکس انسان چونکہ صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے، اس لئے حق کی طرف ہدایت اُس کے اندر ودیعت نہیں کی جاتی۔ یہ اُسے خارج سے وحی کے ذریعے رسول کی وساطت سے ملتی ہے اور اب ختمِ نبوت کے بعد اِسے قرآن میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ قرآن میں ان امور کی وضاحت ملتی ہے کہ:

ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی (48:28)

وہ اللہ ہی ہے، جس نے اپنے رسولوں کو ہدایات کے ساتھ بھیجا۔

وہ رسول اللہ کی طرف سے وحی پا کر دونوں راستے لوگوں کو دِکھلا دیتا ہے۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۚ (90:10)

ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیئے ہیں۔

مزید یہ وضاحت کہ اُن میں انتخاب کا حق بھی ہے کہ

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ (18:29)

ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آ گیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اس پر ایمان لائے، اور جس کا جی چاہے اس سے کفر کرے۔

اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعے الحق کے علم سے آگاہی ہونے سے۔ عقلِ انسانی کی اہمیت کو گھٹایا نہیں گیا، بلکہ اس کی اہمیت کو ایمان لانے کی شکل میں مزید اضافہ کر دیا گیا ہے۔

ایمان کا قرآنی تصور:

ایمان کے لغوی معنی ہیں کسی بات کی سچائی کو پورے سکون اور ذہن کے کامل اطمینان کے ساتھ تسلیم کر کے یقین کرنا۔ یہ علم و بصیرت کی بنا پر دلیل اور برہان کی رو سے دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے بعد، کسی صداقت کو صحیح تسلیم کرنے کا نام ہے۔ اقبال کے مخصوص الفاظ میں:

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اِس کے برعکس ہم اپنی روزمرہ زبان میں ایمان کا ترجمہ عقیدہ کرتے ہیں۔ عقیدہ اور عقل و فکر باہمی طور پر ایک دوسرے کے اندر متضاد کیفیات لئے ہوتے ہیں۔ یعنی جہاں عقیدہ ہوگا، اِس میں دلیل و بُرہان اور بصیرت کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ ایمان عقل و بصیرت سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ اس کی تائید قرآن سے ہمیں خود رسول کی زبانی ملتی ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ (12:108)

ان سے کہو کہ میری راہ تو بالکل (صاف اور سیدھی) ہے اور وہ یہ کہ میں تمہیں خدا کی طرف دلائل و برہان کی رو سے علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور جو میرے متبعین ہوں گے وہ بھی ایسا ہی کریں گے۔

اِس لئے قرآن نے مومنین کی یہ نشانی بھی بتائی ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (25:73)

ان لوگوں (مومنین) کے سامنے جب قرآنی آیات بھی پیش کی جائیں، وہ انہیں اندھے بہرے بن کر اختیار نہیں کرتے۔

اِس کے برعکس وہ اسوہء رسول ﷺ کے مطابق غور وفکر اور بصیرت سے کام لیتے ہیں۔ اس روش کو اختیار کرنے والے اسوہء رسول ﷺ کی پیروی کرنے والے کہلاتے ہیں۔

استثنائی حالت:

ظاہر ہے کہ اگر حق انسان کے سامنے ہی نہ لایا جائے، یا اگر سامنے تو پیش کیا جائے، لیکن وہ اُسے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ رکھتا ہو، تو وہ حق کا انتخاب نہیں کر سکے گا۔ ایسی صورت میں اُسے ذمہ دار اور جوابدہ نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ دنیا میں ہر جگہ قانون میں یہ شرط رکھی گئی ہے کہ انسان معاہدہ کرتے وقت اُنہی شرائط کا ذمہ دار اور جوابدہ کہلاتا ہے، جب وہ آزادانہ طور پر انتخاب کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اسی لئے نابالغ، مجنون ومخبوط الحواس، جبر واکراہ کے تحت معاہدہ کا متن سمجھنے سے معذور لوگ اپنے معاہدہ کے پابند، اور ذمہ دار نہیں ہوتے۔ معذور کی فہرست میں وہ لوگ بھی شامل ہیں، جو غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں، وہ دنیا میں اِن حالات میں زندگی گزار رہے ہیں، جبکہ کہیں بھی اسلامی نظام قائم نہیں جہاں وہ ہجرت کر کے چلے جائیں۔ لیکن اِن کے لئے شرط ہے کہ وہ اِس زندگی کو اسلامی زندگی سمجھ کر اپنے آپ کو تسلی نہیں دیتے بلکہ مانتے ہیں کہ اِس کے سوا سرِ دست چارہ نہیں۔ وہ اپنی طرف سے البتہ اسلامی نظام کی فکر کو عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِس لئے قرآن اُنہیں معذور قرار دیتا ہے۔ قرآن بھی محاسبہ کے لئے اُنہی افراد کو ذمہ دار گردانتا ہے، جو حق کے سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہوں اور حق اُن کے سامنے رکھا بھی جائے۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (17:15)

اور ہم کسی پر عذاب یا تباہی لانے والے نہیں ہیں، جب تک اُن کی طرف پیغام نہ بھیجیں۔

یہ امر بھی ملحوظِ نگاہ رہنا چاہیئے کہ بطور فریضۂ رسالت محمد ﷺ نے نوعِ انسانی کے لئے الحق کے علم کی ہدایات کے لئے عملی طور پر نظام خداوندی کی تشکیل کی تھی۔ اس نظام خداوندی کو آگے چلانا اِس امّت کا فریضہ تھا۔ سمجھنے کے لئے اس فریضے کو فریضہ رسالت کہہ لیجیے، بلکہ تبلیغ رسالت کہیے، جسے امّت نے ادا کرنا تھا۔ محمد ﷺ پر ذمّہ داری تھی کہ جو کچھ نازل ہوا ہے اس کو انسانوں تک پہنچا دے۔ 5:67۔ اب آخری وحی کو انسانوں تک پہنچانا، اور اس کو نافذ العمل رکھنا، اُس کی امّت کی ذمّہ داری ہے۔

The Human Self and Allah

Episode No. 21

By G. A. Parwez
(Translated by: Dr. Ejaz Rasool)

9.12 Revitalizing a Dead Nation with the Blood of Life

For a nation to achieve life again after death, and for it to be once again numbered amongst living nations, is Allah's *Fadl* (2:242). But we have not yet mentioned that greatest *Naimat* of all as a result of which these *Naima* are achieved. The Quran declares:

> And hold fast, all together, by the rope which Allah (stretches out for you) and be not divided among yourselves; and remember with gratitude Allah's favour on you; for you were enemies and He joined your hearts in love, so that by His Grace, you became brethren; and you were on the brink of the pit of fire, and He saved you from it. Thus, does Allah make His Signs clear to you: That you may be guided. (3:103)

In other words, mutual unity: for the Islamic nation to become one Ummah, not to be divided into sects and factions, is that *Naimat* of Allah which became the line of distinction between the era of ignorance and the Islamic period. Subjugation of the universal forces by man is a *Naimat*:

> Do you not see that Allah has subjected to you all things in the heavens and on earth, and has made his bounties flow to you in exceeding measure, (both) seen and unseen…(31:20)

All this is made subject to control by man so that man remains bowed before the

laws of Allah:

> …Thus does He complete His favours on you, that you may bow to His Will (laws). (16:81)

This is that path of guidance (2:150) which was revealed through Rasul-ullah (2:151). And this is what is called Islam which is a complete Deen, and by reaching which all the *Naima* of Allah are achieved:

> …This day have I completed your Deen for you, accomplished My favours upon you, and have chosen for you Islam as your Deen…(5:3)

9.13 How *Naima* are Multiplied

Following the achievement of all these *Naima*, and after this for increase and development in them, this principle is established that whoever does *Shukr* for his *Naima*, his *Naima* will continue to multiply, and whoever does *Kufr* of these *Naima*, his *Naima* will be snatched from him. For *Shukr e Naimat* see the topic under '*Shukr*'. Here it will be sufficient to state briefly that to utilise the *Naima* of Allah according to the correct Divine laws is *Shukr e Naimat*, and to obtain advantage wrongly from them, employing them in unjust ways, is *Kufr*. For example, when the Muslims were bestowed with the *Naimat* of government and state, it was with this purpose:

Those who, if We establish them in the land, establish Salat and organise Zakat, enjoin the right and forbid wrong…(22:41)

As long as they kept fulfilling this purpose the state kept on expanding, and when they turned *Shukr e Naimat* into *Kufran e Naimat* i.e. started taking illegitimate advantage of this great bounty of Allah, the state turned from the 'kingdom of Allah' into a dictatorship, and gradually that *Naimat* was snatched away and then they became bound up in the painful chastisement of humiliation and ruin.

To keep in mind this same purpose, Bani Israel were also instructed: Remember! all these *Naima* have been made available cheaply for you; as long as you continue to display *Shukr* for these, these will continue to multiply, but if you do *Kufr e Naimat* then you will be bound in a severe punishment:

And remember! your Sustainer caused to be declared (publicly): 'If you are grateful, I will add more (favours) unto you; But if you show ingratitude, truly My punishment is terrible indeed.' (14:7)

9.14 Submission to Other than Allah is *Kufr* of *Naimat*

The fundamental and intrinsic form of being grateful for *Naima* is to have *Eimaan* in One Allah and to have *Eimaan* in Allah means to completely deny 'non-Allah' (which the Quran calls *Batil*). Other than Allah, no other rebellious power should be followed nor should any other law be accepted other than His. If this disobedience is done, it will be *Kufr* of *Naimat*:

And Allah has made for you mates (and companions) of your own nature, and made for you, out of them, sons and daughters and grandchildren, and provided for you sustenance of the best: will they then believe in vain things, and be ungrateful for Allah's favours? And obey others than Allah, such as have no power of providing them, for sustenance, with

anything in heavens or earth, and cannot possibly have such power? (16:72-73)

This is because man achieves all *Naima* by obeying the laws of Allah. To relate these to some other power is to declare *Shirk* in opposition to *Tauheed*, and is *Kufr* in opposition to *Shukr* (16:53-55). This reality is explained as follows by an example:

> Allah sets forth a parable: a city enjoying security and quiet, abundantly supplied with sustenance from every place: Yet was it ungrateful for the favours of Allah: so Allah made it taste of hunger and terror like a garment (from every side), because of the (evil) which (its people) wrought. And there came to them a Messenger from among themselves, but they falsely rejected him; so the wrath seized them even in the midst of their iniquities. So eat of the sustenance which Allah has provided for you, lawful and good; and be grateful for the favours of Allah, if it is He Whom you follow. (16:112-114)

9.15 Kufr of *Naima* by the Leaders of a Nation

According to the teaching of the Quran this *Kufr* and *Shukr* are not confined to individuals only; from the point of view of the collective, its effect is very profound. It is apparent therefore that this *Kufr* will commence from the higher echelons who are called national leaders. The consequence of their *Kufr* is that they fall into the pits of hell, taking the whole nation along with them. The Quran states:

> Have you not turned your vision to those who have changed the favour of Allah into blasphemy and caused their people to descend to the house of perdition? Into Hell? They will burn therein, an evil place to stay in! (14:28-29)

The reality is that the nation which, like a herd of buffalo, becomes habitual in following behind men with eyes shut without looking around, meets this same sorry end. Contrary to this, the Divine law saves and removes those people who make use of their heart and mind, intellect and vision, and do not let go of their hold on *Shukr e Naimat* from the encirclement of hell. So, when the nation of Lot was engulfed from all sides by the exemplary hell of destruction and obliteration, then Allah saved those individuals among them who practiced *Shukr* because of their being grateful:

> We sent against them a violent tornado with showers of stones, except Lot's household; them we delivered by early dawn as a Grace from Us. Thus do we reward those who are grateful. (54:34-35)

This is why it is instructed to always entreat Allah for the ability to perform *Shukr e Naimat* (46:15).

9.16 Psyche of Man

But as has been noted in the previous chapter, man happens to be a strange creature. When Allah showers His *Naima* on him, he contravenes His laws, avoids them and sidesteps them. But when these *Naima* begin to be snatched from him as a consequence of his *Kufr*, then he becomes hopeless and despondent:

Yet when We bestow Our favours on man, he turns away and becomes remote on his side, and when evil seizes him he gives himself up to despair! (17:83)

In this appalling environment of deprivation and despair he then returns to the Divine laws, and then in recompense for his being on the right path, he achieves his seized *Naima* and lost treasures again. But after this he again forgets them, and associating these *Naima* to others, begins to do *Shirk*:

…but when He bestows a favour upon him as from Himself, (man) does forget what he cried and prayed for before, and he does set up rivals unto Allah…(39:8)

9.17 Egotistic Attitude

And at other times he exceeds even this, and the menace of egotism embeds itself in his mind, and he starts declaring that I have received all this as a result of my own planning and my own knowledge and skill. What Allah! And what laws of His!

Now when trouble touches man, he cries to Us: But when We bestow a favour upon him as from Ourselves, he says, 'This has been given to me because of a certain knowledge (I have)!' Nay, but thinking like this is the cause for destruction, but most of them understand not! (39:49)

At this point it is important to understand this much that whatever man receives, it is as a consequence of his effort and action. But the question is what part of this endeavour is due to his own effort and what part due to those potentials which he has received automatically. If an individual possesses a higher level of intellect, then he has not purchased this brain himself, he has received it without any effort and payment. This individual earns more compared to the individual who has not received a good brain and declaring it to be the result purely of his own skill, he does not consider anyone else to have a share in it. The Quran declares that the relatively higher earnings of this individual is the consequence of those intellectual potentials of his which were bestowed on him free. Hence by calling this part of his income his own skill, he should not become the sole owner, instead this should be allocated for the common sustenance of mankind according to the Divine law. This is also the condition of man that he never

holds himself responsible for his trouble and worry. Firstly, he tries to hold someone else responsible for this and if this is not possible, then he states that God has unjustly humiliated me, I was not in any way at fault:

> Now, as for man, when his Rabb tries him (as per law), giving him honour and gifts, then says he, (puffed up), 'My Rabb has honoured me.' But when He tries him, restricting his subsistence for him, then says he (in despair), 'My Rabb has humiliated me!' (89:15-16)

This is not the truth – no-one receives *Naima* without any reason, nor are those which have been gained then snatched away without any cause. For this there is an established immutable law of Allah and this law is that in the (good or bad) state of any nation no change occurs till the time that that nation does not produce a change within itself. Changes in the external world are in fact manifested according to changes in the internal psychology of this nation.

9.18 Immutable Law

The Quran states:

> Because Allah will never change the grace which He has bestowed on a people until they change what is in their (own) selfs: and verily Allah is He Who hears and knows (all things). (8:53)

A severe chastisement becomes imposed on that nation which changes the *Naima* of Allah itself in this way:

> Ask the Children of Israel how many clear (Signs) We have sent them. But if any one, after Allah's favour has come to him, substitutes (something else), Allah is strict in punishment. (2:211)

Hence, for this purpose that the significance of being grateful does not remain concealed from the eyes, it is emphasised that *Naima* be displayed. Bani Israel were repeatedly reminded to always keep the *Naima* of Allah in front of them:

> O Children of Israel! call to mind the (special) favour which I bestowed upon you… (2:40) See also (2:122)

Then, addressing the whole of mankind, it was instructed not to let Allah's *Naima* disappear out of sight:

> O mankind! Call to mind the favours of Allah unto you…(35:3)

So much so, that even Rasul-ullah was told to display the *Naima* of his *Rabb*:

But the bounty of your Rabb - rehearse and proclaim! (93:11)

For the same warning it is stated that on the Day of Judgment there will be a question regarding every *Naimat*, about how did you spend and utilise it:

Then, shall you be questioned that Day about the favours. (102:8)

9.19 Let us Recap

From the above discussion this reality has become apparent to us that finding the path of guidance is a *Naimat* of Allah, and that is why messenger-hood and revelation, the Book and wisdom are bounties of Allah which are bestowed on a nation. By walking on this path of guidance the successes, eminences, triumphs and accomplishments of the world are attained. Wealth and prosperity, authority and rule, home and hearth, wife and children, grand palaces, fortified castles, increase in *Jamaat*, supremacy and power over enemies, all of these are *Naima* of Allah. Contrary to this, the snatching away of these *Naima* and the overshadowing of some nation by humiliation and ruin is Allah's punishment. Gratitude for these *Naima* is that these should only be used for those purposes which have been defined by the Divine laws. As a consequence of this gratitude these *Naima* will continue to increase and will keep multiplying, and the roots of a nation will continue to become sturdier. Contrary to this, if a wrong advantage is taken from these, then this is *Kufr* (denial) of these *Naima* and as a result these *Naima* are snatched away; these begin to transform into decline; and since the life of nations is counted not in days but is reckoned in centuries, these *Naima* are therefore snatched away gradually in such an imperceptive way that a superficial glance does not perceive any discernable difference in the state of this nation. This is why man often falls into the trap of thinking that no accountability whatsoever is being taken of the injustices of this nation. So much so that even the nation itself ridicules the immutability of the Law of Requital, mocks it, and in the intoxication of wealth and power does not understand that it is standing at the foot of a mountain containing a volcano within which a silent fire is unceasingly multiplying, until this volcano erupts and the unleashed storm of wave after wave of molten lava engulfs them in its fold, and then no possibility of salvation, no route of escape remains for them, and in its place only their tales remain.

There are thousands of worlds of wisdom and vision, lesson and instruction implicit in the law which the Quran has explained regarding being deprived of *Naima* (the snatching of *Naima*) i.e.:

Because Allah will never change the favour which He has bestowed on a people until they change what is in their (own) selfs: and verily Allah is He Who hears and knows (all things). (8:53)

In relation to the rise and fall of nations this is a great law. As the explanation of this law will be found at another place, a brief summary will suffice here. First of all this reality has been exposed in it that though Allah is definitely Omnipotent, His status is not like that of our worldly rulers who, when they are pleased, bestow a full treasure chest and when they are vexed, snatch it away. The laws of His Will are fixed, and this system of the universe is functioning due to these same laws.

آبروئے ما زِ نامِ مصطفیٰ

از دمِ سیرابِ آلِ اُمّی لقب
لالہ رُست از ریگِ صحرائے عرب

اُو دِلے در پیکرِ آدم نہاد
اُو نقاب از طلعتِ آدم کُشاد

در جہاں آئینِ نو آغاز کرد
مسندِ اقوامِ پیشیں در نوَرد

ہر خداوندِ کہن را اُو شکست
ہر کہن شاخ از نمِ اُو غنچہ بست

عقل را اُو صاحبِ اسرار کرد
عشق را اُو تیغِ جوہر دار کرد

از کلیدِ دیں درِ دُنیا کُشاد
ہمچو اُو بطنِ اُمِ گیتی نزاد

دینِ او آئینِ او تفسیرِ کُل
در جبینِ او خطِ تقدیرِ کُل

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.76
ISSUE
10

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/idaratolueislam1/ www.youtube.com/idaratolueislam

